قرآن کریم اور سنّت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۸۸ شمارہ: ۲
صفر المظفر ۱۴۴۶ھ - ستمبر ۲۰۲۴ء
قیمت فی شمارہ: ۶۰ روپے، زرِ سالانہ: ۷۰۰ روپے

مُدیر/مُدیرِ مسئول
مولانا سیّد سلیمان یوسف بنوری

نائب مُدیر
مولانا سیّد احمد یوسف بنوری

مُدیرِ معاون
مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

ناظم
مولانا فضل حق یوسفی

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ
دفتر ماہنامہ ''بینات''، جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن
کراچی، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر: 3465
فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

اکاؤنٹ نمبر
اکاؤنٹ نمبر: 7-397-0101900 برانچ کوڈ: 00816
مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی

بیرونِ ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک
یورپ اور امریکی ممالک، وغیرہ: 40 امریکی ڈالر
عرب اور ایشیائی ممالک، وغیرہ: 35 امریکی ڈالر

وضاحت

ماہنامہ ''بینات'' میں اشتہارات کی اشاعت کا مقصد تصدیق اور سفارش نہیں ہے۔ ادارہ معاملات کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147
فیکس: 92-21-34919531 +
Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری **مطبع:** شفق پرنٹنگ پریس **طابع:** حافظ ثناء اللہ واحدی

فہرست مضامین

بصائر و عبر

اِک نامبارک مقدمے پر نظرثانی کا غیر متوازن فیصلہ	۳	محمد اعجاز مصطفیٰ
جامعہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد انور بدخشانیؒ کی رحلت	۱۷	

مقالات و مضامین

مکاتیب مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ بنام حضرت بنوریؒ	۱۸	انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری
خودی اور دعا	۲۱	حضرت مولانا ڈاکٹر غلام محمدؒ
دلائلِ شرعیہ اور چند اہم دینی اصطلاحات...تعارف (قسط:۲)	۲۶	افادات: مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
علومِ حدیث کی تطبیق میں اِفراط وتفریط کے مظاہر (قسط:۱)	۳۶	مولانا عبدالمالک/مولانا یاسر عبداللہ
مدارس کو درپیش اصل چیلنج	۴۸	مولانا محمد سلمان بجنوری
دینی مدارس کے بارے میں آئی ایس پی آر کی پریس کانفرنس پر		
اہلِ مدارس کا متفقہ اعلامیہ	۵۰	ادارہ
سرزمینِ فلسطین ... قرآن وحدیث کی روشنی میں (قسط:۲)	۵۳	مولانا محمد ارشد خان

یادِ رفتگان

شیخ اسماعیل ہنیہ شہید رحمۃ اللہ علیہ	۵۶	محمد اعجاز مصطفیٰ

دار الافتاء

صفر المظفر سے متعلق اہم مسائل	۵۹	ادارہ

نقد و نظر

المختار شرح کتاب الآثار ... پانچ منٹ کا مدرسہ	۶۳	ادارہ

اِک نامبارک مقدمے پر نظرِ ثانی کا غیر متوازن فیصلہ

تجزیہ اور تبصرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلامٌ علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

مؤرخہ ۶ر دسمبر ۲۰۲۲ء کو قادیانی ملزم مبارک احمد ثانی کے خلاف ملکی آئین کی دفعہ 295-B اور 295-C اور قرآن ایکٹ 2011ء کے تحت مقدمہ درج ہوا، جو ماتحت عدالتوں کی چھلنی میں چھنتے چھنتے تمام تر قانونی تقاضوں کے تحت سپریم کورٹ آف پاکستان تک پہنچا۔ سپریم کورٹ میں ملزم کے خلاف مقدمہ کی سابقہ کارروائی میں بے بنیاد طور پر قانونی سقم تراشتے ہوئے ملزم کے لیے ضمانت پر رہائی کی استدعا کی گئی، معزز عدالت کے سینئر ججز نے یہ کیس سنا اور مؤرخہ ۶ر فروری ۲۰۲۴ء کو خلافِ توقع ملزم کے حق میں ایسا فیصلہ دیا جو ان واقعات وحقائق سے ہم آہنگ نہیں تھا، جو ایف. آئی. آر سے لے کر اس نوعیت کے جرم کی معروف دفعہ 295-C میں بالکل واضح نہیں تھے۔ اس بنیاد پر سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کو انتہائی، نامناسب، غیر متوازن اور حقائق کے برعکس ہونے کی بنا پر نظرِ ثانی کے قابل سمجھا گیا اور خیر کی توقع کی جانے لگی کہ شاید معزز جج صاحب اپنی سابقہ غلطی کی ہر فورم پر ہر پہلو سے نشان دہی ہونے پر اپنی غلطی کا ازالہ فرمائیں، مگر افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ معزز جج صاحب نے ۲۴ر جولائی ۲۰۲۴ء کو نظرِ ثانی کا جو فیصلہ فرمایا، یہ سابقہ فیصلے سے زیادہ غیر متوازن بلکہ متنازع ثابت ہوا۔ اس فیصلے میں جس تدبر، دوراندیشی اور حقائق کے اِدراک کی توقع تھی، یہ فیصلہ ان توقعات سے عاری محسوس ہوا، بلکہ سابقہ فیصلہ کے مقابلے میں

یہاں پر عجلت، لاعلمی اور غیر مرئی اثرات کا برا تأثر بری طرح نمایاں طور پر محسوس ہو رہا ہے۔ فیصلہ پچاس پیراگرافس پر مشتمل ہے، جن میں سے اکثر پر ہمارا تجزیہ اور تبصرہ ہے۔ اس فیصلے کے غیر واقعاتی پہلو اور جلد بازی کا اندازہ لگانے کے لیے یہ بھی کافی ہے کہ اس فیصلے کے شروع میں مفتی محمد حنیف قریشی کو جامعہ نعیمیہ کراچی کا نمائندہ لکھا گیا، حالانکہ وہ اس کے نمائندے نہیں، اور جناب حبیب الحق شاہ کو جامعہ دار العلوم کراچی کا نمائندہ لکھا گیا، حالانکہ وہ جامعہ نعیمیہ کراچی کے نمائندے ہیں۔

تازہ حکم نامے کے پیراگراف

(۱) میں مسلمان کی تعریف لکھی گئی ہے کہ: ''مسلمان وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی آخری نازل کی ہوئی کتاب اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا آخری نبی مانتا ہو۔'' اور لکھا ہے کہ ختمِ نبوت کا عقیدہ قرآن کریم کی متعدد آیات سے ثابت ہے، ان میں سے سورۃ الاحزاب کی آیت: ۴۰ لکھی گئی ہے۔

(۲) میں عقیدہ ختم نبوت پر ۴/احادیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اسلام کی عمارت کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی نے ہر لحاظ سے مکمل کیا ہے۔

(۳) میں لکھا ہے کہ قرآن وسنت نے یہ واضح کر دیا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نبوت کے ختم ہونے پر ایمان کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوتا، اس پر امام غزالیؒ کے حوالے سے امت کا اجماع نقل کیا ہے۔

(۴) میں واضح کیا ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین ۱۹۷۳ء کی رو سے بھی ''مسلمان'' کی تعریف میں ختم نبوت پر ایمان ضروری ہے۔

(۵) میں واضح کیا گیا ہے کہ ملک کا نام ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' ہے، صدر اور وزیر اعظم کے لیے مسلمان ہونا آئین کی رو سے ضروری ہے۔ ان پانچوں نمبرات میں عدالت نے جو کچھ لکھا، اس پر ہم عدالتِ عظمیٰ کے جج صاحبان کی تحسین وتوصیف اور اس پر ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ لیکن

(۶) میں عدالت نے اس کیس کا جو پس منظر لکھا ہے، وہ مدعی کے وکیل کے بقول ایف۔آئی۔آر کے جملہ مندرجات کا احاطہ نہیں کرتا، اس لیے کہ مدعیِ مقدمہ ایف۔آئی۔آر میں لکھواتا ہے کہ مدعی چار سال سے تحریف شدہ ترجمہ قرآن پاک کی روک تھام کے لیے کوشش کر رہا ہے اور اس نے ہر فورم: وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ، ہوم سیکریٹری اور تمام ذمہ داران کو اس بارہ میں درخواستیں دیں، لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ سائل نے لاہور ہائی کورٹ میں ایک رٹ پٹیشن دائر کی، لاہور ہائی کورٹ نے ۵/ مارچ ۲۰۱۹ء کو تمام اداروں کو حکم دیا کہ تحریف شدہ ترجمہ قرآن پاک چھاپنے والے ملزمان کے خلاف کارروائی کی جائے۔ جس دن ہائی کورٹ کا یہ حکم آیا اس کے اگلے ہی دن یعنی ۶/ مارچ ۲۰۱۹ء کو قادیانیوں نے اعلان کر دیا کہ ۷/ مارچ

۲۰۱۹ء کو چناب نگر میں تفسیرِ صغیر تقسیم کی جائے گی، مدعی نے پھر تھانے میں درخواست دی، لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ ۷ ؍مارچ ۲۰۱۹ء کو قادیانیوں نے اپنے طے شدہ منصوبے کے تحت نصرت جہاں کالج کے گراؤنڈ میں کھلے عام تحریف شدہ تفسیرِ صغیر تقسیم کی، قادیانیوں کی اس جسارت کے تمام ثبوت تھانے میں دیے گئے، لیکن پولیس نے ٹال مٹول سے کام لیا اور کوئی کارروائی نہ کی، اس پر عوامی احتجاج ہوا، پولیس نے عوامی دباؤ کے نتیجے میں جے آئی ٹی بنائی، جس نے ہر زاویے سے اس کی تحقیق کی، قادیانیوں کا جرم واضح ہونے کے بعد ان کے خلاف کارروائی کی بجائے ساڑھے تین سال بعد ۲۰۲۲ء میں معاملہ ''پنجاب قرآن بورڈ'' کو بھیج دیا گیا۔

دسمبر ۲۰۲۲ء میں پنجاب قرآن بورڈ نے اس معاملے کے متعلق تمام دستاویزی ثبوت کا جائزہ لینے کے بعد ضلعی انتظامیہ کو ایف. آئی. آر کاٹنے کا کہا، ایک ماہ بعد تمام ملزمان میں سے صرف ایک ملزم مبارک احمد کو گرفتار کیا گیا جو مدرسۃ الحفظ کا پرنسپل اور اس تحریف شدہ قرآن کریم چھاپنے، اس کی تبلیغ و تعلیم، قرآن کریم کو غیر قانونی مقاصد کے لیے استعمال کرنے، مرزا بشیر الدین محمود کے لیے ''رضی اللہ عنہ'' لکھنے، اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے، اور اہلِ اسلام کے جذبات مجروح کرنے جیسے قبیح اور غیر قانونی جرائم کے ارتکاب میں شریکِ کار رہے۔ گویا ملزم آئین و قانون کی رو سے پانچ جرائم کا مرتکب ہوا: -۱: قادیانی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنا۔ ۲: ''رضی اللہ عنہ'' کو مرزا کے بیٹے کے لیے استعمال کرنا۔ ۳: مسلمانوں کے اجماعی عقیدے کے خلاف قرآن کریم کا ترجمہ شائع کرنا۔ ۴: قرآن پاک کی غلط تفسیر شائع کر کے اہلِ اسلام کے جذبات مجروح کرنا۔ ۵: قرآن پاک کو غیر قانونی مقاصد کے لیے استعمال کرنا۔

ایف. آئی. آر میں موجود ہے کہ مدعی نے تمام ملزمان کے نام دینے کے ساتھ استدعا کی کہ تحریف شدہ قرآن کریم چھاپنے سے لے کر تقسیم ہونے تک تمام معلوم و نامعلوم ملزمان؛ پرنٹر، پبلشر، اوتھر (مصنف)، کمپوزر، پروف ریڈر، اور دیگر معاونین کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ اس بنا پر ایف. آئی. آر میں دفعہ: ۲۹۵ سی، ۲۹۵ بی، پنجاب قرآن ایکٹ ۲۰۱۱ء کی دفعہ: ۷ اور ۹ کے تحت مقدمہ درج کیا گیا، جس پر سیشن کورٹ، ہائی کورٹ نے اس کو سزا دی اور اس کی درخواستِ ضمانت کو مسترد کیا۔ لیکن ہماری سپریم کورٹ کے اس فیصلے میں ملزم مبارک ثانی قادیانی جو قانونی طور پر ناقابلِ اشاعت تفسیرِ صغیر چھاپنے سے لے کر اس کی غیر آئینی و غیر قانونی تقسیم تک تمام شریک ملزمان کی فہرست میں شامل رہا، وہ صرف تقسیم کنندہ ظاہر ہو رہا ہے۔ اس پر ۲۹۵ سی اور ۲۹۵ بی ختم کر کے صرف پنجاب قرآن ایکٹ ۲۰۱۱ء کے تحت رکھا گیا، چونکہ یہ ایکٹ ۲۰۱۱ء مصنف، طابع، ناشر، اور پروف ریڈر کے متعلق ہے اور اسی ایکٹ کے تحت تقسیم کنندہ کا نام ۲۰۲۱ء میں شامل کیا گیا، اور چونکہ یہ وقوعہ ۲۰۱۹ء میں ہوا ہے، گویا جرم پہلے ہوا اور قانون بعد میں بنا، اس لیے عدالت نے کہا کہ اس کو ضمانت دی جاتی ہے۔ حالانکہ اسی فیصلے میں بھی تقسیم، اشاعت ساتھ ساتھ دونوں لکھے ہوئے ہیں، اور اشاعت کا معنی اُردو کی معتبر ویب سائٹ ''ریختہ'' کے مطابق: ''۱: کسی عقیدے یا خیال

وغیرہ کی ترویج وتبلیغ۔ ۲:اخبار یا کتاب چھپنے کے بعد منظر عام پر لائے جانے کا عمل'' لکھا ہے۔ اسی طرح ''نور اللغات'' جلد اوّل میں لکھا ہے: ''اشاعت: (ع) مؤنث: شائع کرنا/مشہور کرنا/شہرت'' اور آگے لکھا ہے: '' اخبار اور کتابوں کے ساتھ زیادہ مستعمل ہے۔'' اس اعتبار سے بھی یہ ملزم مبارک ثانی اس قانونی طور پر نا قابلِ اشاعت اور تحریف شدہ تفسیر صغیر کی تقسیم کی بنا پر بھی اس کی ترویج وتبلیغ، اس کو منظر عام پر لائے جانے، اس کو مشہور کرنے جیسے قبیح اعمال میں ملوث ہے، تو اس لحاظ سے بھی اس کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اسی طرح یہ بات بھی دیکھی جائے کہ مصنف، طابع، ناشر، کمپوزر، ریکارڈ جمع کرنے والا؛ ان سب کے خلاف کارروائی کی استدعا کی گئی، لیکن ان کے بارے میں بھی سپریم کورٹ نے کوئی وضاحت نہیں مانگی کہ آیا یہ لوگ گرفتار ہوئے کہ نہیں؟ اگر ہوئے تو کیا کارروائی ہوئی؟ اور اگر نہیں ہوئے تو کیوں نہیں ہوئے؟ اور مزید اس بابت بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جب قانونی طور پر نا قابلِ اشاعت اور تحریف شدہ تفسیر صغیر تقسیم کے مرحلے تک پہنچی ہے تو کیا مصنف، طابع، ناشر، کمپوزر، ریکارڈ جمع کرنے جیسے مراحل سے گزرے بغیر یہ تحریف شدہ اور قانونی طور پر نا قابلِ اشاعت تفسیر وجود میں آگئی ہے؟ اس معاملے میں یہ فیصلہ خاموش ہے۔

(۷) میں لکھا ہے کہ: ''ایف۔آئی۔آر میں ملزم پر مجموعۂ تعزیرات کی دفعہ ۲۹۵ بی کا ذکر تو کیا گیا ہے، لیکن ایف۔آئی۔آر کے مندرجات میں توہینِ قرآن کا الزام نہ تو بلاواسطہ اور نہ ہی بالواسطہ لگایا گیا تھا۔''

اس بارے میں عرض ہے کہ: ایف۔آئی۔آر میں ۲۹۵-بی، ۲۹۵-سی اور آخر میں ۲۹۸-سی؛ تینوں دفعات کا ذکر ہے، اور تفسیر صغیر میں کئی مقامات پر تحریف کرکے گویا قرآن کریم اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کی گئی ہے۔ قانون کی نظر میں جس طرح کسی کو دھماکا خیز مواد دینا جرم ہے، اسی طرح بم پکڑانا بھی جرم ہی کہلاتا ہے۔ جب ایف۔آئی۔آر میں بتایا گیا کہ تفسیر صغیر (جس میں جابجا تحریف کرکے قرآن کریم کی توہین کی گئی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کی گئی، اس کے علاوہ قرآن کریم کو غیر قانونی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا اس کی) تعلیم وتبلیغ کی جارہی ہے، جس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور اس سے نقضِ امن کا اندیشہ ہے، تو ان سب کے باوجود فیصلے میں یہ کہہ دینا کہ: ''اس میں دفعات کا تو ذکر ہے، لیکن اس میں توہینِ قرآن کا الزام نہ تو بالواسطہ اور نہ ہی بلاواسطہ لگایا گیا۔'' سمجھ سے بالاتر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ تحریف شدہ اور قانونی طور پر نا قابلِ اشاعت تفسیرِ صغیر کی اشاعت وتقسیم بذاتِ خود قرآن کریم کی توہین ہے۔ مزید یہ کہ ایک قادیانی کا اپنے ہاتھ میں تحریف شدہ تفسیر صغیر رکھنا؛ کیا اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے واسطے نہیں؟ اس تفسیر کی تقسیم کرنا تعلیم اور تبلیغ کے زمرے میں نہیں آتا؟ اس تفسیر صغیر میں تحریف کرکے اس کو چھاپنا قرآن کو غیر قانونی مقاصد کے لیے استعمال کرنا لازم نہیں آتا؟ اس تحریف شدہ تفسیر صغیر میں ''رضی اللہ عنہ'' کا مرزا بشیر الدین محمود کے لیے لکھے ہوئے ہونے سے اس لفظ کو غیرِ صحابی کے لیے استعمال کرنا لازم نہیں آتا؟

اور یہ کہنا کہ: ''چونکہ مذکورہ ادارہ جہاں ایف۔آئی۔آر کے مطابق ممنوعہ کتاب تقسیم کی گئی تھی،

احمدیوں کا ادارہ تھا، اس لیے اس فعل پر مجموعۂ تعزیرات کی دفعہ ۲۹۸ -سی کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔'' راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ مجموعۂ تعزیرات کی دفعہ ۲۹۸ -سی کو ایک بار پھر پڑھ لیا جائے، جو کہ درج ذیل ہے:

''دفعہ ۲۹۸ سی ۔ قادیانی گروپ وغیرہ کا شخص جو خود کو مسلمان کہے یا اپنے عقیدے کی تبلیغ یا پرچار کرے:

قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ کا (جو خود کو احمدی یا کسی اور نام سے موسوم کرتے ہیں) کا کوئی شخص جو بلا واسطہ یا بالواسطہ خود کو مسلمان ظاہر کرے، یا اپنے مذہب کو اسلام کے نام سے موسوم کرے، یا موسوم کرتا ہو، یا الفاظ، خواہ زبانی ہوں یا تحریری یا دیکھے جا سکنے والے نقوش، کے ذریعے اپنے مذہب کی تبلیغ یا پرچار کرے، یا دوسروں کو اپنا مذہب قبول کرنے کی دعوت دے، یا کسی بھی طریقے سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح کرے، اسے کسی ایک قسم کی سزائے قید اتنی مدت کے لیے دی جائے گی جو تین سال تک کی ہوسکتی ہے اور وہ جرمانے کی سزا کا بھی مستوجب ہوگا۔''

اب تحریف شدہ اور قانونی طور پر ناقابلِ اشاعت تفسیرِ صغیر جو علانیہ کالج کے بڑے گراؤنڈ میں کئی اداروں کے جمع شدہ طلبہ وطالبات میں تقسیم کی گئی؛ اس سے یہ لازم نہیں آیا کہ:

❶: تفسیرِ صغیر ہاتھ میں ہو تو کیا ایک سادہ لوح آدمی یہ نہیں سمجھے گا کہ یہ آدمی مسلمان ہے، اسی لیے تو اس کے ہاتھ میں تفسیر ہے؟ جب کہ واضح ہے کہ تفسیر کی اصطلاح بھی صرف مسلمانوں کے قرآن کریم کے ساتھ خاص ہے، تو کیا اس عمل سے ایسے لوگوں نے بالواسطہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر نہیں کیا؟

❷: کیا انھوں نے اس عمل سے اپنے عقیدے کا بطور اسلام حوالہ نہیں دیا؟ اور موسوم نہیں کیا؟

❸: کیا اس عمل سے انہوں نے (زبانی، تحریری، ظاہری حرکات سے) دوسروں کو اپنا عقیدہ قبول کرنے کی دعوت نہیں دی؟

❹: کھلے عام کالج کے گراؤنڈ میں تحریف شدہ اور قانونی طور پر ناقابلِ اشاعت تفسیرِ صغیر تقسیم کرکے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچائی؟

❺: ان تمام اعمال کے ہونے کے باوجود فیصلے میں لکھنا کہ: ''چونکہ مذکورہ ادارہ جہاں ایف. آئی. آر کے مطابق ممنوعہ کتاب تقسیم کی گئی تھی؛ احمدیوں کا ادارہ تھا، اس لیے اس فعل پر مجموعۂ تعزیرات کی دفعہ ۲۹۸ -سی کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔'' سمجھ سے بالاتر ہے۔ گویا عدالت بھی مانتی ہے کہ دفعہ ۲۹۸ -سی کی خلاف ورزی تو کی گئی، لیکن وہ قادیانیوں کا ادارہ تھا، اس لیے اس دفعہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔

معزز عدالت کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک آدمی استفسار کرسکتا ہے کہ کیا کسی قانون کے تحت یہ لکھا ہے کہ قادیانی یا لاہوری اپنے ادارے میں تحریف شدہ قرآن کریم یا قانونی طور پر ناقابلِ

اشاعت کوئی کتاب تقسیم کر سکتے ہیں؟ یا اس کی تعلیم اور تبلیغ کر سکتے ہیں؟ اس کی بھی وضاحت کر دی جاتی تو یہ اُلجھن اور مشکل پیش نہ آتی۔ مزید یہ کہ ایف. آئی. آر میں بھی لکھا ہے کہ جن طلبہ اور طالبات میں یہ تحریف شدہ اور قانونی طور پر ناقابلِ اشاعت تفسیر صغیر تقسیم کی گئی؛ وہ کئی اداروں مثلاً: مدرسۃ الحفظ، عائشہ اکیڈمی، مدرسۃ البنات، تین اداروں کے بچوں کو لایا گیا، اور نصرت جہاں کالج کے گراؤنڈ میں کھلے عام یہ تقریب رکھی گئی، اور کہیں نہیں لکھا کہ اس کالج میں صرف قادیانی آسکتے ہیں اور دوسرے سادہ لوح مسلمان نہیں آسکتے۔ جب ایسا نہیں ہے تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ تقریب ان کے ادارے میں ہوئی؟

اسی طرح کیا گورنمنٹ سے کالج کا اجازت نامہ لیتے وقت یہ صراحت کی گئی تھی کہ اس میں صرف قادیانی تعلیم حاصل کرسکیں گے اور دوسرے نہیں؟ راقم الحروف کے علم کے مطابق سرکاری تعلیم گاہیں ہوں یا پرائیوٹ ادارے؛ ان کو اجازت نامہ دیتے وقت ایسی کوئی قید نہیں لگائی جاتی کہ فلاں عقیدہ اور مذہب کا آدمی پڑھ سکتا ہے اور فلاں کا نہیں۔ مزید یہ کہ ہمارے معزز جج صاحبان اس تحریف شدہ اور قانونی طور پر ناقابلِ اشاعت تفسیرِ صغیر کی تقسیم کی ٹائمنگ اور وقت کو بھی مدِّنظر رکھتے تو ان کو صحیح نتائج تک پہنچنے میں دِقّت پیش نہ آتی کہ ۵ / مارچ ۲۰۱۹ء کو ہائی کورٹ کے معزز جج صاحب نے تمام اداروں کو تحریف شدہ ترجمۂ قرآن پاک چھاپنے والے ملزمان کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم صادر فرمایا اور اگلے ہی دن ۶ / مارچ ۲۰۱۹ء کو قادیانیوں نے اعلان کیا کہ کل تفسیرِ صغیر تقسیم کی جائے گی۔ کیا اس سے یہ باور نہیں ہوتا کہ یہ تمام تر کارروائی معزز جج کے حکم کی خلاف ورزی اور توہینِ عدالت تھی اور یہ تمام تر کارروائی صرف اور صرف جان بوجھ کر اور تمام اداروں کے منہ پر طمانچہ تھا کہ تم نے جو کچھ کرنا ہے، کرلو! ہم تمہاری عدالتوں کے فیصلوں کو یوں ردّی کی ٹوکری میں پھینکتے ہیں؟

اور یہ کہنا کہ: ’’عدالت ہذا کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ ملزم قید میں ۱۳ / مہینے گزار چکا ہے، جب کہ ممنوعہ کتاب کی تقسیم کا جرم ثابت ہونے پر اسے جس قانون کے تحت سزا سنائی جاسکتی ہے؛ وہ فوجداری ترمیمی قانون ۱۹۳۲ء کی دفعہ: ۵ ہے، جس کے تحت زیادہ سے زیادہ ۶ مہینے تک کی سزائے قید دی جاسکتی ہے۔‘‘

اس کے بارہ میں وکلاء کا کہنا یہ ہے کہ یہ قانون بنیادی طور پر پریس اینڈ ایمرجنسی پاور ایکٹ ۱۹۳۱ء کا حصہ ہے، مگر یہ قانون تو آج سے ۶۴ سال قبل پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈی نینس ۱۹۶۰ء کے ذریعے ختم کر دیا گیا، جس کے ثبوت میں پی ایل جے ۲۰۲۱، سی آر سی ۱۷۷۲ اور ۲۰۲۲ ایس سی ایم آر ۱۵ اعلیٰ عدلیہ کے فیصلے دیکھ لیے جائیں۔

مزید یہ کہ معزز عدالت تفسیرِ صغیر کو کالعدم کتاب تسلیم کرتی ہے۔ درحقیقت یہ مصحف قرآن پاک ہے، جسے ٹریزن ایبل اور سیڈیشن ترجمہ اور تشریح موجود ہونے پر حکومتِ پنجاب نے ۲۰۱۶ء سے قانونی طور پر ناقابلِ اشاعت قرار دے رکھا ہے۔ قانونی طور پر ناقابلِ اشاعت مواد رکھنا دہشت گردی ایکٹ

۱۹۹۷ء کی دفعہ ۸ اور ۱۱ ڈبلیو کے تحت جرم ہے، جس کی بابت یہ حکم نامہ خاموش ہے۔

(۸) میں پنجاب حکومت کی درخواست کا ذکر ہے، جس میں مذہبی آزادی کے حق کو معترضہ حکم نامہ ''قانون، امن عامّہ، اور اخلاق کی قیود'' کے بغیر ذکر کیا گیا۔ اس کا عدالت نے آگے جا کر جواب دیا ہے۔

(۹) میں عدالت عظمیٰ کی جانب سے معترضہ حکم نامے پر تنقید کو غلط فہمی پر مبنی قرار دیا اور آگے خود ہی غلطی کے امکان کو مانتے ہوئے کہا کہ اسی لیے نظرِ ثانی کی اپیل کا حق دیا جاتا ہے۔

(۱۰) میں اسلامی تاریخ میں فقہاء کرام کی جانب سے قاضیوں کے فیصلوں پر علمی تنقید اور اس کی مثالیں پیش کی گئیں۔

(۱۱) میں دس اداروں کے نام اور عدالت کی جانب سے انھیں نوٹس دیے جانے کا ذکر ہے۔

(۱۲) میں عدالت کی صراحت کہ فوجداری مقدمے میں نظر ثانی کے موقع پر مقدمے کے اصل فریقوں کے سوا کسی کو فریق نہیں بنایا جا سکتا، سوائے اس شخص کے جو مقدمے کے فیصلے سے براہِ راست متأثر ہو۔

(۱۳) میں فاضل ایڈیشنل پروسیکیوٹر جنرل پنجاب کا کہنا تھا کہ معترضہ حکم نامے میں آئین کی دفعہ ۲۰ کا حوالہ دیا گیا، لیکن یہ حوالہ ادھورا ہے، کیونکہ اس میں مذکورہ دفعہ کے ابتدائی الفاظ: ''قانون، امن عامّہ، اور اخلاق کے تابع'' نقل نہیں کیے گئے۔ انہوں نے اس بات پر بھی دلائل دیے کہ ایف. آئی. آر میں مذکورہ حقائق کی بنیاد پر مسؤل الیہ نمبر: ا کے خلاف مجموعۂ تعزیرات کی دفعہ ۲۹۵ -بی کی فردِ جرم عائد کی جا سکتی تھی۔ شکایت کنندہ کے وکیل نے بھی یہ دلیل دی۔

عدالتِ عظمیٰ کی جانب سے اس پیراگراف میں پہلی بات کہ: ''دفعہ ۲۰ کا حوالہ ادھورا ہے۔'' کا جواب یہاں نہیں دیا گیا، آگے جا کر دیا ہے۔ دوسری بات کا جواب یہ دیا گیا کہ مسؤل علیہ نمبر: ا کے وکیل نے اعتراض کیا کہ نظر ثانی میں حکومتِ پنجاب کی جانب سے صرف ایک استدعا کی گئی ہے (کہ دفعہ: ۲۰ کا حوالہ ادھورا ہے۔) اب وہ اس پر اضافہ نہیں کر سکتے۔ گویا عدالت بھی مانتی ہے کہ دفعہ: ۲۹۵ -بی کا اطلاق ہو سکتا تھا، جس کا پہلے فیصلے میں اطلاق نہیں کیا گیا۔ عوامی اُمنگوں کے مطابق جب نظر ثانی کا فیصلہ کیا گیا اور نظر ثانی کی استدعا میں چونکہ پنجاب حکومت نے صرف ایک ہی استدعا کی تھی، اس لیے ۲۹۵ -بی کی فردِ جرم عائد نہیں کی جا سکتی۔

گویا بظاہر قانونی پیچیدگیوں کا سہارا لے کر اور جواز بنا کر ملزم کو ضمانت دی گئی، حالانکہ پاکستانی عوام کا تو مطالبہ ہی یہ تھا کہ قانون کے مطابق اور ایف. آئی. آر کے مطابق اس مقدمے کا صحیح فیصلہ سنایا جائے، اس فیصلے میں جو جو سقم اور کمزوریاں ہیں' ان کو دور کیا جائے، لیکن نظر ثانی میں بھی ان کا تدارک نہیں کیا گیا۔ عدالتِ عظمیٰ کی اس بات سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ پنجاب حکومت کے فاضل ایڈیشنل پروسیکیوٹر جنرل پنجاب نے اس مقدمے کو سنجیدگی اور بیدار مغزی سے پیش نہیں کیا۔ اگر ایسا صحیح بھی ہو تو عدالت عظمیٰ

سے یہ درخواست تو کی جاسکتی ہے کہ وہ مسؤل علیہ نمبر: ا کے فاضل وکیل سے کہہ سکتی تھی کہ جب ایف. آئی. آر میں دفعہ: ۲۹۵-بی کا ذکر ہے اور اس پر دلائل بھی دیے گئے ہیں تو ان دلائل کی روشنی میں دفعہ: ۲۹۵-بی کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس میں کوئی قانونی رکاوٹ تھی، یا اس پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اور یہ بھی کہا کہ: ''ایف. آئی. آر وُقوعے کے تقریباً تین سال بعد درج کی گئی ہے اور اس کا کوئی جواز پیش نہیں کیا جاسکا۔''

تو گزارش یہ ہے کہ مذہبی معاملات میں ایف. آئی. آر کا ایسا پیچیدہ اور مشکل نظام بنایا گیا ہے کہ اس میں وفاقی سطح کا افسر جب تک محلِ وقوع کا معائنہ نہ کرلے یا جب تک وہ اجازت نہ دے تو ایف. آئی. آر نہیں کاٹی جاسکتی۔ اس مقدمے میں بھی مدعی وقوعے کے دن سے مسلسل افسرانِ بالا کو درخواستیں دیتا رہا، لیکن شنوائی نہ ہوئی، حتیٰ کہ ہائی کورٹ کے حکم کے بعد پولیس جے آئی ٹی بنی اور پھر پنجاب تحفظِ قرآن بورڈ کی طرف سے اس کو بھیجا جانا اور ان کی طرف سے انتظامیہ کو حکم دیا جانا، اس میں اتنی تاخیر ہوئی، گویا تاخیر کی وجوہات مقدمے کی فائل میں درخواستوں کی صورت میں موجود ہیں، لیکن شاید اُن کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔

(۱۴) میں ناشر کے مفہوم میں تقسیم کنندہ شامل ہے یا نہیں؛ اس پر بحث کی گئی ہے۔

(۱۵) میں شکایت کنندہ کی جانب سے تفسیرِ صغیر تقسیم کیے جانے کی بنا پر اس پر غیر قانونی مقصد کا اطلاق ہونے کا ذکر۔ مسؤل علیہ نمبر: ا کے وکیل کی جانب سے ''طاہر نقاش بنام ریاست'' مقدمے کا حوالہ دیا گیا، حالانکہ پیراگراف: ا۴ میں عدالت نے لکھا ہے کہ اس مقدمے میں احمدی ملزم پر الزام یہ تھا کہ اس نے اپنی عبادت گاہ کے اندر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا اور قرآن مجید کے نسخے رکھے تھے...الخ۔ لیکن سوچنا چاہیے کہ اس مبارک ثانی مقدمے میں اس ملزم پر تحریف شدہ تفسیرِ صغیر تحریر کرنے، چھاپنے سے لے کر تقسیم کرنے تک کے الزامات ہیں۔ ''طاہر نقاش بنام ریاست'' مقدمے پر اس کو قیاس کرنا صحیح نہیں۔

(۱۶) میں دس اداروں کو نوٹس دیے گئے، ان کے نام اور ''المورد'' کا بحیثیتِ ادارہ کوئی موقف نہ ہونے کا ذکر۔

(۱۷) میں لکھا ہے کہ: ''اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ: عدالت نے اسلامی عقیدے کو محض ''قرآن'' پر مبنی قرار دیا ہے، یہ ناقص بات ہے۔ اسلامی عقائد ''قرآن اور سنت'' دونوں پر مبنی ہوتے ہیں۔'' اس پر عدالت نے کہا کہ: ہم نے ایسا نہیں کہا۔ کونسل نے معترضہ فیصلے میں آیات کو بے محل قرار دیا اور کہا کہ: ''اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ جہاں غلط کام ہو رہا ہو تو مسلمان اس کو شرعی وقانونی طریقوں سے نہ روکیں۔'' اس پر عدالت نے کہا کہ: کسی کو شرعی وقانونی طریقہ اختیار کرنے سے روکا نہیں تھا اور نہ ہی ایسا حکم دے سکتے ہیں۔ عدالت نے لکھا کہ کونسل نے دین کے معاملے میں جبر کی ممانعت کو تو تسلیم کیا، مگر اسے اس حد تک محدود کردیا کہ کسی کو اس کی مرضی کے بغیر اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔

راقم الحروف اس پر عرض کرتا ہے کہ اس کا دائرہ محدود کونسل نے نہیں کیا، بلکہ مفسرین نے اس آیت کا اپنی تفاسیر میں محدود دائرہ ہی ذکر کیا ہے، اور اس کو عدالت عظمیٰ نے ''مجیب الرحمٰن بنام ریاست'' میں بھی واضح کیا ہے، جیسا کہ فیصلے کے نمبر: ۲۰ میں ''مجیب الرحمٰن بنام ریاست'' فیصلے کے تحت چند اقتباسات بطور حوالہ نقل کیے جائیں گے۔

(۱۸) پانچ اداروں کا موقف جناب مفتی حبیب الحق نے پڑھا اور اس میں کہا گیا کہ عدالت نے معترضہ حکم نامے میں قرآن کریم کی آیات سے غلط استدلال کیا اور مقدمہ بعنوان: ''مجیب الرحمٰن بنام حکومتِ پاکستان'' میں وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے اور مقدمہ بعنوان: ''ظہیر الدین بنام ریاست'' میں سپریم کورٹ کے فیصلے سے انحراف کیا ہے۔

عدالت نے کہا کہ ہم نے مقدمہ ظہیر الدین بنام ریاست کے فیصلے سے انحراف نہیں کیا، نہ ہی کر سکتے ہیں، کیونکہ یہ فیصلہ بڑے بنچ کا تھا جو پانچ فاضل ججوں پر مشتمل تھا۔

(۱۹) جامعہ محمدیہ غوثیہ بھیرہ کے مفتی شیر محمد خان نے قرآن کریم کے حوالے سے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس نام نہاد عبادت گاہ کو ڈھا دینے کا حکم دیا تھا؛ جہاں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں، اور اسے مسجد ضرّ ار کا نام دیا تھا۔ جناب ڈاکٹر عمیر محمود صدیقی نے بھی اپنی انفرادی رائے میں یہ دلیل دی تھی۔ اس پر عدالت نے کہا کہ یہ عبادت گاہ جن لوگوں نے بنائی تھی؛ انہوں نے اسے نام مسجد کا دیا تھا، جس سے بعض مسلمان دھوکے میں پڑ سکتے تھے، جب کہ پاکستان کے قانون میں پہلے ہی سے پابندی ہے کہ احمدی اپنی عبادت گاہ کو مسجد نہیں کہہ سکتے اور نہ ہی خود کو مسلمان کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔... الخ۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ مفتی صاحب اور ڈاکٹر عمیر صدیقی نے یہ حوالہ محض مسجد نام رکھنے پر نہیں دیا تھا کہ جسے یہ کہہ کر خاموش کرا دیا جائے کہ پاکستان کے قانون میں پہلے ہی سے پابندی ہے کہ قادیانی اپنی عبادت گاہ کو مسجد نہیں کہہ سکتے، بلکہ ان حضرات کا کہنا یہ تھا کہ اس جگہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں، اور یہ سازشیں بھی ادارے میں ہو رہی تھیں، جس کی بنا پر اسے منہدم کیا گیا۔ مطلب یہ کہ کوئی اسلام یا مسلمانوں کے خلاف علانیہ سازش کرے، تب بھی مجرم ہے، یا نجی طور پر کرے، تب بھی وہ مجرم ہے۔ اسلامی ریاست کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اسلام، مسلمانوں اور ریاست کے خلاف کہیں بھی کوئی سازش نہ ہونے دے۔ اور یہ واقعہ خود دلیل ہے اس بات کی کہ قادیانیوں کو چاہے ان کے گھر، عبادت خانے یا مخصوص نجی ادارے ہوں؛ کہیں بھی اسلام، ریاست اور مسلمانوں کے خلاف کسی فعل اور عمل کی اجازت نہیں۔

(۲۰) میں لکھا ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کے سامنے مجیب الرحمٰن مقدمے میں یہ معاملہ اُٹھایا گیا

کہ پاکستان میں احمدیوں کو اپنے مذہب اور عقیدے پر عمل سے روکا جارہا ہے تو عدالت نے اپنے فیصلے میں قرار دیا کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کی اجازت ہوتی ہے اور اس ضمن میں عدالت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر مسلموں کے ساتھ معاہدات کا حوالہ دینے کے علاوہ عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور بعد کی اسلامی تاریخ سے کئی مثالوں کا ذکر کیا۔

اس کے جواب میں راقم الحروف مقدمہ: مجیب الرحمٰن بنام ریاست ''قادیانیت کے خلاف اعلیٰ عدالتوں کے تاریخی فیصلے'' (مؤلفہ: محمد متین خالد) نامی کتاب سے یہ اقتباس نقل کرنا چاہتا ہے:

''کسی غیر مسلم کے اس حق پر ایسی کوئی آئینی، قانونی یا شرعی پابندی نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اعلان کرے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دعوے میں سچا تسلیم کرے، قرآن کریم کو اچھے دستورِ حیات کا حامل تسلیم کرے اور اس کے احکام پر عمل پیرا ہو ...۔ چھٹے سوال کا واضح جواب یہ ہے کہ ایسے غیر مسلم سے قرآن وسنّت کی عائد کردہ شرائط؛ جن کا تذکرہ مناسب موقع پر آئے گا، کے تحت دوسری اقلیتوں جیسا سلوک کیا جائے...۔''

آگے لکھا کہ:

''مسٹر مجیب الرحمٰن نے ''اکراہ'' کے بارہ میں جو چار اصول بنائے ہیں، وہ بھی قطعی ہیں۔ لیکن تیسرے اصول کا اطلاق جیسا کہ مسٹر مجیب الرحمٰن نے کیا ہے، درست نہیں ہے۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ کسی شخص کو طاقت کے استعمال سے، اس کے دین سے نہیں نکالا جاسکتا۔ اپنے تحریری دلائل میں وہ اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں: ''جیسا کہ ہمیں نکالا گیا ہے۔'' زیرِ بحث آرڈی نینس میں ایسی کوئی بات نہیں کہ انہیں اپنے مذہب سے نکال دیا گیا ہے۔

یہ استدلال کیا گیا تھا کہ احمدیوں پر اپنے آپ کو مسلمان کہنے یا ایسا ظاہر کرنے پر پابندی عائد کرنا، انہیں اپنے دین سے جو ان کے مطابق اسلام ہے، نکالنے کے مترادف ہے۔ اس سوال پر ہم پہلے غور کرچکے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہر دو عقیدوں کے قادیانی مسلمان نہیں ہیں، بلکہ غیر مسلم ہیں۔ لہٰذا آرڈی نینس انہیں اپنے آپ کو ایسا کہنے سے روکتا ہے، جو وہ نہیں ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنے آپ کو جھوٹ موٹ مسلمان ظاہر کرکے کسی شخص خصوصاً امتِ مسلمہ کو دھوکا دینے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ یہ امر پہلے واضح ہوچکا ہے کہ مرزا صاحب اور لاہوری گروہ کے سوا دیگر قادیانیوں نے اپنے آپ کو ایسی جماعت کی جگہ جس میں قرآن کریم کی محبت اور عقیدت سب سے بلند ہے، مسلم جماعت قرار دے لیا ہے۔ یہ برداشت نہیں کیا جاسکتا اور غیر مسلموں کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ امت کا شیرازہ بکھیر کر مسلمانوں کے حقوق اور مراعات پر قبضہ کرلیں۔ پھر یہ امر قادیانیوں کے مرزا صاحب کو

خواہ نبی یا مجدد یا مہدی معہود یا مسیح موعود ماننے کے حقوق پر بھی اثر انداز نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے ان کے اس حق میں مداخلت ہوتی ہے کہ وہ اپنے مذہب پر عمل کریں اور اس کے اصولوں کے مطابق اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کریں۔... شریعتِ اسلامیہ غیر مسلموں کو اپنے دین کو ماننے، نیز اس پر عمل کرنے کا پورا تحفظ دیتی ہے۔'' (۲۱۶ تا ۲۱۸)

اس فیصلے میں آگے چل کر لکھا کہ:

''متوکل علی اللہ کے زمانے میں ذمیوں پر کچھ زیادتیوں کی مثالیں مل سکتی ہیں، لیکن ان کے پس پردہ ایک عنصر یہ تھا کہ اس وقت خود غیر مسلم' قائم حکومت کے خلاف سازشیں کرنے لگے تھے اور ایسی سازشیں ان کی عبادت گاہوں میں تیار ہوتی تھیں۔ بدیں وجہ حکومت کو ان کا لباس مقرر کرنے اور ان کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے کی ضرورت پیش آئی۔'' (۲۲۴)

آگے لکھا کہ:

''تاہم یہ تمام دلائل غیر متعلق ہیں، کیونکہ زیر بحث قانون قادیانیوں کو اپنا عقیدہ بدلنے اور اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔...لیکن نہ وہ مسلمان ہیں اور نہ ہی یہ امور اکراہ، جبر یا دھمکی کے ان اصولوں کے تحت آتے ہیں جن پر آیات کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان آیات کا اطلاق کسی اور دین کو چھوڑ کر اسلام قبول کرنے پر ہوتا ہے۔'' (۲۲۷)

راقم الحروف یہ عرض کرتا ہے کہ آئین میں بھی ان کو قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ لکھا گیا ہے، یہ ایک گروپ اور گروہ تو ہے، لیکن کوئی مذہب نہیں۔ قادیانیت کوئی مذہب نہیں۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ ہے کہ قادیانی' مسلمانوں کے شعار کے علاوہ اپنے شعار بنائیں اور حکومتِ پاکستان کے تحت اپنے آپ کو رجسٹرڈ کرائیں، ان سے کوئی جھگڑا نہیں اور غیر مسلموں کے تحت اپنی مذہبی آزادی حاصل کریں۔

جب قادیانیت کسی مذہب کا نام نہیں اور نہ ہی گورنمنٹ کے تحت یہ رجسٹرڈ ہے، بلکہ یہ صرف ایک جعل ساز گروہ ہے جو مسلمانوں کے شعار کو استعمال کر کے دوسرے انسانوں کو دھوکا دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ ہر سوسائٹی یا دستور وقانون میں کسی جعل ساز کے کوئی حقوق نہیں ہوتے۔

(۲۱)''پانچ اداروں کے مشترکہ موقف میں یہ نکتہ بھی اُٹھایا گیا کہ جس تقریب میں مسؤل علیہ پر کتب کی تقسیم کا الزام تھا، وہ ''مدرسۃ الحفظ، عائشہ اکیڈمی ومدرسۃ البنات'' کی تقریب تھی اور ان ناموں سے عام مسلمان دھوکے میں پڑ سکتے ہیں۔ کیا احمدیوں کے ادارے کے لیے ایسا نام رکھنے پر مجموعۂ تعزیرات کی دفعہ: ۲۹۸-سی کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں؟ عدالت نے اس پر کہا کہ: یہ سوال اس مقدمے میں عدالت کے سامنے نہیں ہے، نہ ہی ایف. آئی. آر میں مسؤل علیہ پر یہ الزام ہے کہ یہ نام اس نے رکھے تھے۔''

گویا عدالت عظمیٰ مانتی ہے کہ ''مدرسۃ الحفظ، عائشہ اکیڈمی، مدرسۃ البنات'' نام رکھنا، اپنے آپ

کو مسلمان ظاہر کرنا، قرآن کریم کو اپنی کتاب کہنا، اور مدرسہ کے لفظ سے دھوکا دینا پایا تو جاتا ہے؛ لیکن چونکہ مدعی نے یہ الزام نہیں لگایا تو اس لیے دفعہ: ۲۹۸-سی کا اطلاق نہیں کیا گیا۔'' اس سے گویا قادیانیوں کی آئین شکنی کے باوجود انہیں صاف بچالیا گیا ہے، ورنہ اتنے دوسرے امور عدالت از خود زیرِ بحث لے آئی ہے۔

بہر حال! آگے پیراگراف ۲۵ تا ۳۹ میں اس قانون کے بننے کے حالات، واقعات، مراحل، مقصد، اور اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کا ذکر ہے، جو بہت ہی عمدہ انداز اور پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس پر ہم عدالت کے شکر گزار ہیں۔

البتہ قادیانیوں اور لاہوریوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے، ان کی طرف سے قانون کی خلاف ورزیوں کی بنا پر ۲۶/اپریل ۱۹۸۴ء کا امتناعِ قادیانیت آرڈی نینس کا جاری ہونا اور اس قانون کا حصہ بن جانا، پھر اس کی خلاف ورزیوں پر مقدمات بننا اور اس قانون کو عدالتوں میں چیلنج کیا جانا اور اس پر اعلیٰ عدالتوں کے تاریخی فیصلوں کے صادر ہونے کے اتنا عرصہ بعد عدالتِ عظمیٰ کی جانب سے ایک بار پھر ۱۹۷۴ء میں پارلیمنٹ میں کی گئی اراکینِ اسمبلی کی تقاریر کا حوالہ دینا کہ وہ بھی چاہتے تھے کہ ان کو مذہبی آزادی دی جائے؛ یہ کچھ صحیح نہیں لگتا، کیونکہ قانون بن جانے کے بعد قانون ہی ان تمام وضاحتوں کے لیے کافی اور شافی ہوتا ہے، جیسا کہ اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں میں اس قانون کی تمام تشریحات آگئی ہیں۔

(۴۰) ''فیصلے میں یہ بھی قرار دیا گیا کہ جن انتظامی احکامات کو اس مقدمے میں چیلنج کیا گیا تھا، ان کا اطلاق احمدیوں کے صرف ان افعال پر ہوتا ہے جو وہ عوامی سطح پر انجام دیں، نہ کہ ان افعال پر جو وہ اپنے گھروں یا عبادت گاہوں میں کریں۔''

اس پر اتنا عرض کریں گے کہ یہ عدالتی فیصلے اس وقت ظہور میں آئے جب قادیانیوں نے سوسالہ جشن منانے کا فیصلہ کیا، اور روڈوں پر چراغاں کیا، جھنڈیاں لگائیں، بینر وغیرہ لگائے، اور کہا کہ ہم شکرانے کے نوافل ادا کریں گے، غریبوں میں کھانا تقسیم کریں گے۔ اس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہونا اور امنِ عامہ کا مسئلہ پیدا ہونا یقینی تھا، تو اس پر انتظامیہ نے پابندی لگادی اور پھر قادیانی عدالتوں میں اپیلیں لے کر گئے، تو اس پر عدالتوں میں یہ فیصلہ دیا گیا کہ یہ مذکورہ بالا کام اپنے گھروں اور عبادت گاہوں میں کریں۔ اس میں کہیں نہیں لکھا کہ اپنے گھروں میں بیٹھ کر اپنے مذہب کی تبلیغ کریں، قرآن کریم میں تحریف کریں، اپنے آپ کو مسلمان کہیں، یا مسلمانوں کی اصطلاحات اور شعائر کا مذاق اُڑائیں۔

(۴۱) میں مقدمہ بعنوان ''طاہر نقاش بنام ریاست'' کا تذکرہ کیا ہے، لیکن اس کا حوالہ اس مقدمے میں بنتا نہیں، اس لیے کہ اس میں تین باتیں ہیں: ثابت کرے کہ قرآن کریم کے کس نسخے یا کسی اقتباس کی قصداً توہین کی گئی ہے یا اسے نقصان پہنچایا گیا یا اس کی بے حرمتی کی گئی ہے اور یہ غیر قانونی مقصد کے تحت کی گئی ہے۔ یہ تو عدالت نے کام آسان کر دیا، کیونکہ ہم نے یہ ثابت کرنا ہے کہ صرف ایک توہین

ہوئی ہے، تفسیرِ صغیر میں قرآن کریم کی توہین کی گئی ہے۔ تو طاہر نقاش کے فیصلے کا حوالہ دینا یہاں درست نہیں ہوگا۔ سورۃ التحریم میں حضرت مریم علیہا السلام کے تذکرے میں تفسیرِ صغیر کے اندر جو حاشیہ ہے، اس میں لکھا ہے کہ: ''آئندہ زمانے میں خدا کی طرف سے ایک آدمی ظاہر ہوگا ... الخ۔'' (ص: ۷۸۵) اور مرزا غلام قادیانی کی کتاب کشتیٔ نوح مندرجہ روحانی خزائن، ج: ۱۹، ص: ۵۰ میں لکھا ہے کہ: ''مجھے مریم سے عیسیٰ بنایا گیا... الخ۔'' اس طرح سورۃ التحریم کی آیت کو مرزا پر چسپاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ محترمہ کی توہین ہے، اور مسلمانوں اور عیسائیوں کی دل آزاری کا باعث ہے۔ اس کے علاوہ بھی پوری تفسیر اس طرح کی تحریفات سے بھری پڑی ہے۔

(۴۲) میں عدالت نے کہا: ''آئینی و قانونی دفعات اور عدالتی نظائر کی اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ احمدیوں کے دونوں گروہوں کو غیر مسلم قرار دینے کے بعد انہیں آئین اور قانون کے مطابق اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے اور اس کے اظہار اور اس کی تبلیغ کا حق اس شرط کے ساتھ حاصل ہے کہ وہ عوامی سطح پر مسلمانوں کی دینی اصطلاحات استعمال نہیں کریں گے، نہ ہی عوامی سطح پر خود کو مسلمانوں کے طور پر پیش کریں گے۔ تاہم اپنے گھروں، عبادت گاہوں اور اپنے نجی مخصوص اداروں کے اندر انہیں قانون کے تحت مقرر کردہ ''معقول قیود'' کے اندر ''گھر کی خلوت'' کا حق حاصل ہے۔''

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ قادیانیوں اور لاہوریوں کو غیر مسلم قرار دینے کے بعد انہیں آئین اور قانون کے مطابق اپنے مذہب پر عمل کرنے کا حق ہے، لیکن ان آئینی و قانونی دفعات اور عدالتی نظائر سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ وہ اپنے مذہب کے اظہار اور اس کی تبلیغ کا حق اپنے گھروں، عبادت گاہوں اور اپنے نجی مخصوص اداروں کے اندر کرسکیں گے؟

معزز عدالت کے جج صاحبان سے بڑے ادب کے ساتھ عرض ہے کہ آپ کے اسی فیصلے کے پیراگراف نمبر: ۴۰ میں درج ہے کہ: ''فیصلے میں یہ بھی قرار دیا گیا کہ جن انتظامی احکامات کو اس مقدمے میں چیلنج کیا گیا تھا، ان کا اطلاق احمدیوں کے صرف ان افعال پر ہوتا ہے جو وہ عوامی سطح پر انجام دیں، نہ کہ ان افعال پر جو وہ اپنے گھروں یا عبادت گاہوں میں کریں۔''

عرض ہے کہ اس میں اپنے عقیدے کا اظہار، تبلیغ، دعوت، یا اسلامی شعار اور اصطلاحات کا استعمال اپنے گھروں اور عبادت گاہوں اور نجی اداروں میں کر سکتے ہیں۔'' کہاں سے ثابت ہوا؟ اسی طرح مقدمہ (بعنوان: طاہر نقاش بنام ریاست) سے گھروں، عبادت گاہوں اور اپنے مخصوص نجی اداروں میں عقیدے کا اظہار یا تبلیغ یا اسلامی شعار کے اظہار اور استعمال کی اجازت کیسے ثابت ہوتی ہے؟ اس لیے کہ اس مقدمے میں بھی لکھا ہے کہ وہاں کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا اور قرآن مجید رکھے ہوئے تھے۔ اس سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتا۔

(۴۸) میں لکھا ہے کہ: ''مسلمانوں کو سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کس کام میں ہے اور کیا ان

اعمال سے رسول اللہ ﷺ خوش ہوں گے؟''

اس بارہ میں اتنا عرض ہے کہ قادیانی مسلمانوں کے مخالف نہیں، بلکہ حضور اکرم ﷺ کے موہن، انبیا کرامؑ کے موہن، اہل بیتؓ کے مخالف، اور تمام امتِ مسلمہ کو کافر کہنے والے، اور اپنے آپ کو کافر ہونے کے باوجود مسلمان کہنے والا گروہ ہے، اس لیے عدالت ان کو مسلمانوں کا مخالف کہہ کر ان کے جرم کو ہلکا نہ کرے۔ خلاصہ یہ کہ بظاہر اس مقدمے میں درج کی گئی ایف. آئی. آر کے مطابق فیصلہ سامنے نہیں آیا۔

۲- اس فیصلے کے پیراگراف نمبر ۶ اور ۷ میں کافی ابہامات ہیں۔

۳- پیراگراف نمبر ۳۸ میں ظہیر الدین بنام سرکار مقدمے کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جسٹس سلیم اختر نے اپنے فیصلے میں قرار دیا ہے کہ قادیانی اپنی حدود کے اندر بھی وہ کام نہیں کرسکتے جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں، ہاں جو مخصوص نہ ہوں؛ وہ کرسکتے ہیں۔

۴- پیراگراف نمبر ۴۲ سب سے افسوس ناک ہے، جس کے تحت انہیں گھر کی خلوت کا حق دیا گیا ہے، حالانکہ آئین وقانون میں ایسا کہیں نہیں لکھا ہوا۔ عدالتی نظائر ''ظہیر الدین بنام سرکار'' و ''طاہر نقاش بنام ریاست'' میں بھی گزر چکا ہے کہ گھر کے اندر بھی توہین نہیں کرسکتے۔ محض قرآن رکھنا جرم نہیں، بلکہ اس کے اندر تحریف شدہ مواد جرم ہے جو کہ تفسیر صغیر میں ہے۔ کیا ذاتی اداروں کے اندر کوکین، حشیش وغیرہ رکھنا جائز ہے؟

۵- اب آگے یہ مسائل کھڑے ہوں گے کہ نجی ادارے کی تعریف کیا ہے؟ کیونکہ بہت سے ادارے نجی وعوامی دونوں ہوتے ہیں۔ اب کیسے فرق کیا جائے گا؟ کیا کسی شخص کو گھر کے اندر بائبل یا ہندوؤں کی مقدس کتاب کی توہین کی اجازت ہوگی؟ آگے عید، قربانی وغیرہ عبادات کے اندر بھی مسائل پیدا ہوں گے۔

نیز یہ کہ پیراگراف نمبر: ۴۲ نے پچھلی باتوں مثلاً ایف. آئی. آر ۳ سال بعد درج کی گئی وغیرہ پر پانی پھیر دیا ہے، کیونکہ جب نجی اداروں میں سب کرنے کی اجازت ہے تو ایف. آئی. آر درج کرانے کی ضرورت کیا رہ گئی؟ اس کے علاوہ نمبرات میں کوئی ایسی بات نہیں، جس پر کوئی وضاحت کی جائے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اُمتِ مسلمہ کی حفاظت فرمائے، ہمارے ملک وقوم اور اداروں کی عزت و توقیر میں اضافہ فرمائے، ملک کو امن وامان کی نعمت سے مالا مال فرمائے اور آخرت میں ہمیں حضور اکرم ﷺ کی شفاعت نصیب فرمائے، آمین بجاہ سید المرسلین!

الغرض نظرثانی کی اپیل پر حالیہ فیصلے کے بارے میں تجزیہ یا تبصرہ کا ایک رُخ یہ ہے، ماہرینِ قانون اس پر مزید روشنی ڈال سکتے ہیں۔

جامعہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد انور بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے شیخ الحدیث ورکن مجلسِ شوریٰ، محدث العصر حضرت بنوریؒ اور مولانا نور احمدؒ (ناظم اول دارالعلوم کراچی) کے داماد اور جامعہ کے اساتذہ مفتی انس انور بدخشانی اور مولانا عمر انور بدخشانی کے والد ماجد حضرت مولانا محمد انور بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ کافی عرصہ علیل رہنے کے بعد ۷ / صفر المظفر ۱۴۴۶ھ مطابق ۱۳ / اگست ۲۰۲۴ء پیر اور منگل کی درمیانی شب رحلت فرما گئے، إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، إِنَّ لِلّٰهِ مَا أَخَذَ وَلَهٗ مَا أَعْطٰى وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِأَجَلٍ مُّسَمًّى. اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ، وَعَافِهٖ وَاعْفُ عَنْهُ، وَأَكْرِمْ نُزُلَهٗ، وَوَسِّعْ مُدْخَلَهٗ، وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ، وَنَقِّهٖ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ، وَأَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ ، اٰمِيْنَ .

آپؒ کی نمازِ جنازہ جامعہ بنوری ٹاؤن میں ۷ / صفر المظفر بروز منگل بعد نمازِ ظہر ادا کی گئی، اور دارالعلوم کراچی کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

جامعہ کے رئیس حضرت مولانا سیّد سلیمان یوسف بنوری ، نائب رئیس حضرت مولانا سیّد احمد یوسف بنوری ، ناظمِ تعلیمات حضرت مولانا امداد اللہ یوسف زئی ، ادارہ بینات ، اساتذہ اور طلبہ حضرتؒ کی رحلت پر رنجیدہ اور مغموم ہیں اور غم کے اس موقع پر حضرتؒ کے صاحبزادگان اور لواحقین سے دِلی تعزیت اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ بلاشبہ حضرتؒ کی رحلت آپؒ کے اہل وعیال، طلبہ وعلماء اور جامعہ کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرتؒ کی جملہ دینی وعلمی خدمات کو قبول فرمائے، درجات بلند فرمائے، اور تمام پسماندگان بالخصوص مفتی انس انور بدخشانی ، مولانا عمر انور بدخشانی ، احمد انور بدخشانی، صاحبزادیوں اور اہلیہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

تفصیلی مضمون ان شاء اللہ بعد میں لکھا جائے گا۔

قارئینِ بینات سے حضرتؒ کے لیے ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

و صلى الله تعالىٰ على خير خلقهٖ سيدنا محمد و علىٰ آلهٖ و صحبهٖ أجمعين

..... ❀ ..... ❀ ..... ❀ .....

سلسلۂ مکاتیب حضرت بنوریؒ

مکاتیب محدثِ کبیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ

بنام حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۰؍ربیع الآخر سنہ ۱۳۸۱ھ

عمدة الأفاضل ونخبة الأماثل، صديقي الوفي الكريم مولانا محمد يوسف البنوري،
متّعنا الله بحياته في عافية!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

الحمد للہ بخیر ہوں، اور آپ کی خیر وعافیت کے لیے دست بدعاء، اثنائے سفرِ حجاز میں خط لکھنے کا جو تقاضا آپ نے کیا تھا، بار بار یاد آیا، لیکن علالت اور کچھ دوسری اُلجھنوں میں امتثالِ امر سے اب تک قاصر رہا، یہ بھی دریافت نہ کرسکا کہ آپ نے میرے بعد ''دمشق'' کا سفر کیا یا نہیں؟ اور وہاں سے کیا ''طُرَف'' ساتھ لائے؟ اس سفر میں آپ کی طرف سے جس ''مروّت وکرم'' کا ظہور اس ناچیز کے حق میں ہوا، اس کے لیے میں بہ دل وجان ممنون ہوں، حق تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الحاج مولانا محمد بن موسیٰ میاں بہت دنوں سے ''مصنف عبد الرزاق'' پر کام کرنے کے لیے مجھ کو لکھ رہے ہیں، پہلے تو میں کمزوریِ صحت کی بنا پر بالکل آمادہ نہیں تھا، لیکن اب مختلف احباب کی خواہش کی وجہ سے کچھ آمادہ ہو رہا ہوں، بشرطیکہ کوئی معاون ساتھ ہو، معاون کے لیے ۵۰-۶۰ روپے ماہوار تجویز ہو رہے ہیں، مگر اس تنخواہ پر کوئی کام کا معاون دست یاب ہونا متعذّر رہے، اس سلسلے میں موصوف کو آپ بھی کچھ رہنمائی کریں تو شاید کام شروع ہوجائے، ابھی تو موصوف شش وپنج میں ہیں۔

دیوبند سے ''انوار الباری'' کا مقدمہ پہنچا ہوگا، اس کی نسبت جناب کے کیا تأثرات ہیں؟ ''الجامعة الإسلامية'' (مدینہ منورہ) کے قیام کا فرمان تو شاہ سعود نے جاری کردیا، اس فرمان پر عمل کب سے شروع ہو

رہا ہے؟ اور طلبہ کے داخلہ کی کیا صورت تجویز ہو رہی ہے؟ کچھ معلوم ہو تو لکھیے۔

شرح یا تعلیقاتِ ترمذی (معارف السنن) کے باب میں کیا کام ہو رہا ہے؟ اس کی طباعت تو بے توقُّف شروع ہو جانی چاہیے۔ والسلام

حبیب الرحمٰن الاعظمی

---

۲۱ / جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۸۱ھ

جلیل المآثر، وارث العلوم والمعارف کابرًا عن کابرٍ، زاده الله عزًّا وکرامةً!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

والا نامہ شرفِ صدور لایا، بڑی مسرّت ہوئی، حق تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔

''مصنّف عبد الرزاق'' کے باب میں ''ناپ تول'' کا سلسلہ جاری ہے، مجھے لکھا تھا کہ: ''اگر بصورتِ وظیفہ ڈیڑھ دو سو پہنچتے رہیں، جس میں آپ کے لیے سو ڈیڑھ سو کا گزارہ ہو، اور پچاس ساٹھ کا کوئی صاف نویس معاون ساتھ رہے الخ۔'' میں نے لکھا: ''اچھا تو یہ ہے کہ میرا کام بلا معاوضہ رہنے دیجیے، باقی رہا معاون تو ایسا معاون جو میرے کام میں مدد دے سکے (یعنی صرف مسوّدہ نقل کرنے والا نہ ہو) پچاس ساٹھ میں یہاں نہ ملے گا۔ ''مشکاۃ''، ''جلالین'' و''ہدایہ'' پڑھانے والے یہاں سوا سو پاتے ہیں، اس سے کم استعداد کا معاون ساتھ رکھ کر کیا کروں گا؟ اور اگر میرے باب میں بھی معاوضہ پر اصرار ہو تو میں نے آپ کا نام لیا کہ ان سے مشورہ کر لیجیے، وہ جو فرماویں گے میں قبول کرلوں گا۔'' اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔

''انوار الباری'' کے باب میں میرا تأثر بھی وہی ہے، جو آپ کا ہے، میں نے کچھ غلطیوں کی نشان دہی کردی ہے، کچھ مُخلصانہ مشورے دے دیئے ہیں، مگر صحیح بات وہی ہے جو آپ نے لکھی ہے کہ کام بہت اہم اور بڑی ذمہ داری کا ہے، ایسی ذمہ داری جس سے عہدہ برا ہونا آسان نہیں ہے۔

خدا کرے ''معارف السنن'' کی اشاعت کا جلد سامان ہو جائے۔ ''تحفة الأحوذي'' کی پہلی جلد کی نسبت سنا تھا کہ مصر سے چھپنے والی ہے، ناشر و طابع کا نام معلوم نہیں ہوا تھا، ''محمد نمنکانی'' (مشہور مصری ناشر و کتب فروش) سے میری خط و کتابت نہیں ہے۔ میری رائے میں سرِدست اور کچھ نہیں ہو سکتا تو تنقیدات کے جواب ضمیمہ ہی کے طور پر چھپ جائیں، اور اس کام کی ذمہ داری آپ قبول فرمائیں۔

مولانا عبد الرشید صاحب نعمانی کا پتہ مجھے معلوم نہیں ہے، اس مجبوری سے اس لفافہ میں ان کے نام بھی ایک خط بھیج رہا ہوں، اگر ان تک بھجوانے کی زحمت فرمائیں تو کرم ہوگا۔

حبیب الرحمٰن الاعظمی

مئو، اعظم گڑھ

۱۸؍جولائی سنہ ۱۹۶۷ء

إلی الأستاذ الخبیر الفاضل مولانا محمد یوسف البنوري، زادہ اللہ عزًّا وکرامةً!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کی یہ خوش قسمتی قابلِ رشک ہے کہ بلا ناغہ سال بہ سال زیارتِ حرمین کی سعادت حاصل کر لیتے ہیں، میں تو بے خبر تھا، جب میں نے ’’کتاب الزھد‘‘ آپ کے نام بھجوائی اس وقت علم ہوا۔ حق تعالیٰ مبارک فرمائے، اور ہم کو بھی یہ دولت نصیب کرے۔ ’’کتاب الزھد‘‘ پر ہر تبصرہ نگار کے تبصرہ سے زیادہ آپ کے تبصرہ کا انتظار ہے، اس سے میری حوصلہ افزائی کے علاوہ اُمید ہے کہ اس کے اقتناء (حصول) کا شوق بھی اہلِ علم کے دلوں میں پیدا ہوگا، اور ’’مجلسِ إحیاء المعارف‘‘ کا بار کسی حد تک ہلکا ہو جائے گا، ارکانِ مجلس بھی آپ کے تبصرے کے لیے چشم براہ ہیں، دفتر سے مکرر نسخہ کا مطالبہ ’’مالیگاؤں‘‘ پہنچا تھا، ناظمِ مجلس بہت ادب کے ساتھ معذرت خواہ ہیں کہ کتاب کی تیاری پر بہت .... گراں آئی ہے، مکرر نسخہ مجلس پر بار ہوگا، محض از راہِ لطف وکرم ایک ہی نسخہ قبول فرما کر تبصرہ فرما دیں تو یہ مجلس کی اعانت ہوگی۔ مجھے اُمید ہے کہ دفتر کے کارکن حضرات اس معذرت کو قبول فرمائیں گے۔

عزیزم مولانا محمد طاسین سلّمہ نے ’’معارف السنن‘‘ جلد سوم کی خوش خبری لکھی تھی، یہ جلد کن ابواب تک پہنچی ہے؟ اب کے سفر میں آپ کو کونسا نادر علمی تحفہ حاصل ہوا؟ اشارہ فرمائیں گے۔ کویت والوں نے ’’فقہی انسائیکلوپیڈیا‘‘ کی تیاری میں قلمی حصہ لینے کے لیے مجھ کو بھی لکھا ہے۔ کبھی کبھی خیر وعافیت سے مطلع فرما دیا کریں تو بہت زیادہ موجبِ مسرّت ہوگا۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

والسلام

حبیب الرحمٰن الاعظمی

بقلمِ رشید احمد

پس نوشت: خادم رشید احمد مفتاحی (راقمِ سطور) بھی مؤدبانہ سلام پیش کرتے ہوئے دعائے خیر کا آرزومند ہے۔

نوٹ: یہ مکتوب، کارڈ پر لکھا گیا ہے، پتہ یوں درج ہے:

’’بگرامیِ خدمت حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، مدرسہ اسلامیہ عربیہ، نیوٹاؤن، کراچی نمبر: ۵

(Karachi 5 , W.Pakistan)

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

خودی اور دعا

حضرت مولانا ڈاکٹر غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ
بی اے جامعہ عثمانیہ

میں کسی کے آگے دامنِ احتیاج پھیلاؤں؟ اظہارِ عجز کروں؟ یہ تو میری خودی کی موت ہے، میں تو سب سے اعلیٰ واشرف ہوں، مسجودِ ملائکہ ہوں، مجھ سے بااختیار اس کائنات میں کون ہے؟ میری ضرب سے سمندر کا سینہ شق اور ہوا کا دامن چاک۔ اس دبدبہ وسطوت کے ہوتے ہوئے سائلانہ روش اختیار کروں؟ اپنے مقام سے گر جاؤں؟ اپنی حیثیت کو بھول جاؤں؟ یہ تو مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا؟

بندۂ عقل اسی لاف وگزاف میں تھا کہ یکایک کسی صاحبِ بصیرت نے للکارا، او بصیرت کے اندھے! تو سب کچھ سہی، پھر بھی یہ تو دیکھ کہ کیا تو مختارِ محض ہے؟ کیا تیرا مجد وشرف خود اختیاری ہے؟ کیا تو موجود بالذات ہے؟ قائم بالذات ہے؟ اے حدوث کے پُتلے! ذرا اپنی حقیقت کو تو پہچان، نہ تیرا وجود اختیاری نہ تیری صفات ذاتی، بلکہ تو جو کچھ ہے اور جیسا کچھ ہے اپنے بل بوتے پر ایک آن بھی قائم نہیں رہ سکتا، رہا تیرا زعمِ اختیار تو یہ بھی اپنی ابتدا وانتہا میں جبر ہی کی کڑیوں میں معلق ہے! باقی جس کا اختیار واقعتاً چل رہا ہے اور جو حقیقتاً بااختیار، خود بخود اور قائم بالذات ہے، وہ تو اپنی خلاقیت اور قیومیت کے باوجود غیب ومستور ہے، وہی جو چاہتا ہے دیتا ہے اور جب چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ عقل پرستوں کے اندھے پن کی کوئی انتہا ہے کہ ہوا میں لہراتے ہوئے پرچم کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ پرچم خود لہرا رہا ہے، اس پر شیر کی جو تصویر بنی ہے اس کو دیکھ کر ڈرتے ہیں، اُف شیر بپھر بپھر کر حملہ کر رہا ہے، نادان یہ نہیں جانتے کہ یہ محض دستِ صبا کا کرشمہ ہے، بلکہ خود ہوا بھی کسی غیبی اشارہ پر چل رہی ہے۔ سن عارف رومیؒ کیا کہہ رہے ہیں:

ما ہمہ شیراں ولے شیرِ علم — حملہ ما از بد باشد دم بدم
حملہ ما پیدا و ناپیدا ست باد — جاں فدائے آں کہ ناپیدا ست باد
باد ما و بود ما از داد تست — ہستی ما جملہ از ایجاد تست

بس تیری اور تیرے اختیار وطاقت کی حقیقت اتنی ہی ہے، پھر اس پر گھمنڈ کیسا؟ مخلوق میں سب سے

اشرف و بااختیار ہو کر بھی تو اپنے خالقِ حقیقی کے آگے ہیچ بلکہ کالعدم ہے، وہ منبع جود و عطا اور تو سراپا احتیاج!! پس مخلوق کے آگے تیرا جھکنا اپنی امید و خوف کو حادث سے وابستہ کرنا یقیناً خود کی موت اور شرفِ انسانی کا جنازہ ہے، لیکن خود اپنے خالق و قیوم سے بے نیازی، یہ تو سراسر خود فریبی ہے! ہر غیر سے بے نیاز ہو کر اپنے مالک کا ہمہ وقت نیاز مند ہو رہنا، سب سے مستغنی ہو کر ''المغني'' کا ہر ارادہ کی تخلیق و تکمیل میں دست نگر بنا رہنا، یہی تو کیشِ ابراہیمی ہے، اسی سے تو حدوث کو بقا کا سہارا ملتا ہے اور حیاتِ جاودانی بنتی ہے، پس اپنے عجز کا اعتراف اور بارگاہِ صمدیت سے استمداد جس کا نام ''دعا'' ہے، تیرے دن رات کا وظیفہ بلکہ ہر سانس کا مشغلہ ہونا چاہیے:

''رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً وَّهَيِّئۡ لَـنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا'' (کہف، ع:۱)

''اے ہمارے رب! دے ہم کو اپنے پاس سے بخشش اور پوری کردے ہمارے کام کی درستی۔''

کیونکہ وحی ربانی نے تیری حیثیت یہی بتائی جتائی ہے۔

''يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الۡغَنِىُّ الۡحَمِيۡدُ'' (فاطر، ع:۳)

''اے لوگو! تم سب محتاج ہو اللہ کے اور اللہ ہی غنی اور حمید ہے۔''

گرفتارِ عقل نے اہلِ بصیرت کی یہ باتیں جو سنیں تو اس کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے، اتنا تو مان ہی لیا کہ ''رب'' سے بے نیازی ہلاکت کا پیش خیمہ ہے، پل بھر کے لیے بھی اس کی نظرِ کرم ہٹ جائے تو بس ہم عدم ہیں! مگر کج رو عقل پھر بھی ایک مغالطہ کھا گئی، اس نے کہا: تیری باتیں سب بجا و درست، مگر میرا رب محض قیوم و مستعان ہی نہیں، بلکہ وہ بڑا علیم و خبیر بھی ہے، میری ہر احتیاج اس پر روزِ روشن سے زیادہ عیاں اور میری ہر حاجت روائی میں وہ ہر مہربان سے بڑھ کر مہربان ہے، پھر میں اس سے کیوں مانگوں؟ کیا میرے مانگے بغیر نعوذ باللہ اس کو میری حاجت و ضرورت کا علم نہ ہوگا؟ ہرگز نہیں، وہ دانا و بینا ہے، اس کے جانتے اس سے مانگنا یہ تو ایک گستاخی ہے، جسارت بے جا ہے، میں تو اس کے تصور سے بھی لرز جاتا ہوں!

صاحبِ بصیرت نے یہ منطق جو سنی تو ہنس پڑا، کہنے لگا: بندۂ عقل! کہاں مادی عقل کے زور پر ان حقائق کو سمجھنے چلا ہے، یہ تو عقلِ ایمانی سے پوچھنے کی باتیں ہیں۔ اے نادان! اللہ کا علیم و خبیر ہونا مسلم، بلاشبہ اس کو تیری اطلاع کی حاجت بھی نہیں، مگر یہ تو بتا کہ اس کے علم قدیم و محیط سے تیری اس خلش کی تسکین کیسے ہوگی جو ہر ناپیدا مستقبل سے متعلق تیرے اندر اُبھرتی رہتی ہے؟ تیرا حال تو یہ ہے کہ:

گفتند ہر چہ در دلت آید ز ما بخواہ گفتم کہ بے حجابیٔ تقدیرم آرزو ست

(اقبالؒ)

یعنی جب تک تجھ کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ علیم و خبیر تیرے ساتھ کیا معاملہ کرے گا؟ مہر کا یا قہر کا؟ اس وقت تک تیرا اضطراب کیسے مٹ سکتا ہے؟ دیکھا نہیں کہ اسی ذہنی اضطراب سے پریشان ہو کر موحدِ کامل ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے والدین اور اولاد کے لیے اسی علیم و خبیر رب سے کیا کچھ نہیں مانگا اور مانگتے ہی رہے، حالانکہ

اس کا بھی اعتراف اور اقرار تھا کہ:

''رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ'' (ابراہیم، ع:۶)

''اے ہمارے رب! تجھ کو سب کچھ معلوم ہے جو ہم اپنے دل میں رکھیں اور جو ظاہر کردیں اور اللہ سے کوئی چیز بھی چھپی نہیں، نہ زمین میں نہ آسمان میں۔''

غور کرنے کا مقام ہے کہ علم وخبر کے اقرار کے باوجود پھر بھی فریاد کیوں ہے؟ وہی نامعلوم مستقبل کے خوف سے جو درد وکسک پیدا ہورہی ہے، اس کی تسکین مطلوب ہے! جس کی صورت اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ اپنی طرف سے نالہ وشیون کرکے ہر شر سے حفاظت اور ہر خیر کی ضمانت حاصل کرلی جائے، چنانچہ تیری اسی نفسیات کا پاس ولحاظ کرکے رب علیم وخبیر نے غایتِ کرم سے اذنِ عام دیا کہ:

''اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ''

''تم مجھ سے مانگو میں تمہاری سنوں گا۔''

پس دعا کیا ہے؟ خوف وحزن کا تریاق! اس تریاق کو استعمال نہ کیا تو ہموم وغموم تجھ کو ہلاک کردیں گے، زندگی موت سے بدتر ہوجائے گی۔ پھر بات اتنی ہی نہیں! ذرا فکر کو مہمیز لگا، دیکھ کہ تجھ میں اور تیرے خالق میں ایک اور تعلق بھی ہے، بہت نازک مگر بڑا پائیدار، وہ حسن وعشق کا تعلق ہے، ادھر حق تعالیٰ سرچشمۂ جمال وکمال ہے اور ادھر انسان میں عشق کا جوہر آبدار، کیسے ممکن ہے کہ حسن کی دلفریبیاں ہوں اور عشق کی فداکاری دبی رہ جائے۔ دیکھا نہیں کہ عاشقِ صادق موسیٰ (علیہ الصلاۃ والسلام) کو جب حسنِ ازل نے شرفِ کلام بخشا تو پوچھا تو صرف یہی تھا کہ ''مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى'' (اے موسیٰ! تیرے داہنے ہاتھ میں کیا چیز ہے؟) اس کا جواب تو صرف اسی دولفظی جملہ پر ختم تھا کہ ''هِيَ عَصَايَ'' (یہ میری لاٹھی ہے) مگر زبانِ عشق اس پر کہاں تھم سکی، موقع جو پایا تو عرض معروض کا ایک سلسلہ شروع کردیا کہ:

''اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى'' (طٰہٰ، ع:۱)

''اس پر میں سہارا لیتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور اس سے میرے کئی اور بھی فائدے ہیں۔''

ذرا عاشقانہ تکلم کی خوبی تو دیکھ کہ بات بڑھا کر ختم بھی کی تو ایسے الفاظ پر جو خود تفصیل طلب تھے کہ شاید بارگاہِ حسن سے تفصیل کا اشارہ ملے اور عرضِ شوق کا ایک اور موقع ہاتھ آجائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا حضرت موسیٰ ؑ کی اس سب تفصیل سے نعوذ باللہ ذاتِ علیم وخبیر کے علم واطلاع میں اضافہ مقصود تھا؟ حاشا وکلا، یہاں تو صرف کلام ہی مقصودِ تکلم تھا، جذبۂ عشق کی تسکین البتہ غایت الغایت تھی اور یہ کچھ حضرت موسیٰ ؑ پر منحصر نہیں، تجھ میں بھی عشق کی چنگاری ہے، اگر اس کے اظہار کا موقع نہ ملے تو گھٹ کر مرجائے، اسی لیے خالقِ فطرت

نے بہ ہمہ علم وخبر تیرے جذبۂ عشق کی تسکین کے لیے اجازت بھی دی اور یقین بھی دلایا کہ:

''فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ''

''تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔''

یہ عشق پر حسن کا انعام واحسان ہے، اب اس ایقان کے ساتھ جب تو ''رَبِّيْ'' کا نعرۂ عاشقانہ بلند کرے گا تو تیرے تصور کے کان ''عَبْدِيْ'' کا جواب ضرور سنیں گے اور تو قبولیت کے یقین سے سرشار ہو جائے گا۔ اب حمد وثنا ہو یا استمداد کی التجا، اس سب سے تیرا مقصود محبوب سے لطفِ خطاب حاصل کرنا ہوگا، اس منزل میں آ کر تو اسی پر مسرور ومشکور ہوگا کہ عرض ومعروض کا ایک موقع تو مل گیا، ورنہ کہاں ہمارا عشق ناتمام اور کہاں وہ بارگاہِ حسنِ تمام، یہ نکتہ میں نے عاشقِ ربانی عارف رومی سے پایا کہ:

از دعا نبود مرادِ عاشقاں — جز سخن گفتن بہ آں شیریں دہاں

پس اب دعا کیا ہے؟ محض جذبۂ عشق کی تسکین!

حافظ! وظیفۂ تو دعا گفتن است وبس — دربند آں مباش کہ نشنید یا شنید

بندۂ عقل پر دل کی یہ پراسرار باتیں جادو کر گئیں، وہ ندامت وحسرت میں ڈوب گیا کہ عقل کو رہنما بنا کر وصالِ محبوب سے کس قدر دور رہا، ایک جھنجھلاہٹ کے ساتھ وہ کہہ اُٹھا:

آزمودم عقل دور اندیش را — بازمی دیوانہ سازم خویش را

بندۂ عقل کے اس اعتراف اور رجوع سے صاحبِ بصیرت کا دل پگھل گیا، شفقت ودرد کے لہجے میں اس نے ''دعا'' کے اور بھی لطیف اسرار بیان کیے کہ:

انسان پابندِ عقل ہو کر خودی نا آشنا بن گیا، اس کا شرف صرف یہی نہیں کہ وہ مسجودِ ملائکہ اور فاتحِ کائنات ہے، بلکہ اس کی عظمت کا اوج تو یہ ہے کہ اس کو بارگاہِ ازل میں ''محبوبیت'' کا رتبہ حاصل ہے۔ دیکھا نہیں کہ ابلیس گو مقرب رہا، مگر ذرا سی سرکشی میں راندۂ بارگاہ کر دیا گیا اور تیرے جدِ اعلیٰ آدم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے بتانے جتانے کے باوجود لغزش ہوئی، ہوسکتا تھا کہ اس پر گرفت سخت ہوتی اور آدم کو اپنے بچاؤ کی صورت بھی کوئی سجھائی نہیں دے رہی تھی، مگر ربِ رحیم کے اس مخصوص اندازِ کرم پر حور وملائک بھی رشک کھا گئے ہوں تو عجب نہیں کہ آدم کے قلبِ لرزاں میں خود بارگاہِ عفو ہی سے ''دعا'' کا جذبہ پیدا فرما دیا گیا اور ''کلماتِ دعا'' بھی القا کیے گئے، قرآن گواہ ہے کہ:

''فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ''

''پھر آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھے۔''

کہا یہ گیا کہ اے آدم! تم اپنی زبانِ معذرت یوں کھولو:

''رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ'' (الاعراف، ع:۲)

’’اے رب! ہم نے اپنی جان پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم تو تباہ ہی ہوجائیں گے۔‘‘

ہم معاف کردیں گے۔ چنانچہ دھڑکتے ہوئے دل اور لڑکھڑائی زبان سے آدم نے جب یہ دعا کی تو معافی اور بخشش کا پروانہ فوراً مل گیا:

’’ثُمَّ اجْتَبٰہُ رَبُّہٗ فَتَابَ عَلَیْہِ وَھَدٰی ‘‘

’’پھر اس کے رب نے اس کو نوازا تو اس پر مہربانی سے توجہ کی اور سیدھی راہ دکھائی۔‘‘

دیکھ لیا، نوازش کا بہانہ ’’دعا‘‘ ہی کو بنایا گیا، ’’مناجاتِ مقبول‘‘ پہلے عطا کی، پھر دامنِ مراد بھر دیا۔

کریمِ ازل کی یہ لطف نوازی صرف آدم ہی کے ساتھ نہ تھی، بلکہ آج بھی ہر اس آدم زاد کے ساتھ ہے جو محبتِ الٰہی کے اس درجے کو پہنچ چکا ہو کہ اس کی ’’مُحِبّیت‘‘ نے محبوبیت کا شرف پالیا ہو، اب وہ محبوبِ سبحانی ہے، اس کا دل، دلنواز نے سنبھال لیا ہے۔

’’قلب المؤمن بين اصبعين من أصابع الرحمٰن.‘‘ (الحدیث)

’’مومن (کامل) کا قلب رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے۔‘‘

وہی جب چاہتا ہے دل کو سکینت سے معمور کرکے شکر پر اُبھارتا ہے اور جب چاہتا ہے سوز و گداز پیدا کرکے فریاد و زاری اور دعا و مناجات پر مضطر کردیتا ہے۔ اب دعا بھی دلبر کی طرف سے ہے اور عطا بھی اسی کا کرشمہ، عارف رومیؒ نے اس رمز کو کس خوبی سے بیان کیا ہے:

آں دعائے بے خوداں دیگر است   آں دعا زو نیست گفت داور است

آں دعا حق می کند چوں او فنا است   آں دعا و آں اجابت از خدا ست

یہ ’’دعا‘‘ کا نقطۂ اوج ہے، یہاں پہنچ کر انبیاء کے معاملے میں وحی الٰہی ہے اور خاصانِ حق کے معاملے میں الہامِ ربانی اور بہرصورت ’’محبوبیت‘‘ کی نشانی ہے، اسی لیے تو سید العارفین صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کے رتبہ وشرف کو یوں ظاہر فرمایا کہ: ’’الدعاء هو العبادة‘‘ ... ’’دعا ہی اصل عبادت ہے۔‘‘

یہ نکتہ کی باتیں تھیں جو زبان کہہ سکی اور قلم لکھ سکا، آگے اللہ پاک سے التجا ہے کہ تجھ کو ’’دعا‘‘ کا خوگر بنا کر زینہ بہ زینہ اس کے مراتب کا مشاہدہ کرائے کہ:

دعا

۱- عرفانِ نفس کا لازمی نتیجہ ہے   ۲- خوف وحزن کا تریاق ہے

۳- جذبۂ عشق کی تسکین ہے   ۴- الہامِ ربانی اور شرفِ محبوبیت کی نشانی ہے!!

(قندِ مکرر از ماہنامہ بینات، شمارہ: ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۳ء)

دلائلِ شرعیہ اور چند اہم دینی اصطلاحات

افادات: حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

تعارف و احکام (دوسری اور آخری قسط)

مرسلہ: ابو اسامہ، کراچی

علت وحکمت کا بیان

اجتہاد کے ذریعہ حکم کی علت سمجھ کر اس کو متعدی کرنا جائز ہے

اجتہاد سے جس طرح حکم کا استنباط کرنا جائز ہے، اسی طرح اجتہاد سے حدیث کو معلَّل سمجھ کر مقتضائے علت پر عمل کرنا جائز ہے، جس کا حاصل احکامِ وصفیہ کی تعیین ہے مثلِ احکامِ تکلیفیہ کے یا احد الوجوہ پر محمول کرنا یا مطلق کو مقید کرنا اور ظاہر الفاظ پر عمل نہ کرنا، ایسا اجتہاد بھی جائز ہے۔

علت نکالنے کا کس کو اور کن مواقع میں حق ہے؟

ہر شخص کو علل بیان کرنے کا حق نہیں ہے، بلکہ مجتہد کو حق ہے اور مجتہد کو بھی ہمیشہ حق نہیں، بلکہ وہاں تعلیل کا حق ہے جہاں تعدیۂ حکم کی ضرورت ہو۔ اور جو اُمور تعبدی ہوں جن کا تعدیہ نہیں ہوسکتا، وہاں قیاس کا مجتہد کو بھی حق نہیں، اسی لیے فقہاء کرام نے صلوٰۃ وصوم، زکوٰۃ وحج میں تعلیل نہیں کی، ان کی فرضیت کی بناء تعبد ہے۔

ہر شخص کو علت نکالنے کی اجازت نہیں

میں نے ان کو لکھا کہ احکامِ شریعت میں آپ کو کیا حق ہے علت نکالنے کا؟ اگر اسی طرح وجہ نکالی جائے تو کوئی حلال‘ حلال اور کوئی حرام‘ حرام نہ رہے، کیونکہ ہر شخص اپنی منشا کے مطابق علت نکال لے گا حلت کی یا حرمت کی، مثلاً کسی نے حرمتِ زنا کی یہ علت نکالی کہ اس سے اختلاطِ نسب ہوتا ہے، یعنی اگر کئی مرد ایک عورت سے صحبت کریں اور پھر حمل رہ جائے تو ممکن ہے کہ ہر ایک ان میں سے اپنے نسب کا

دعویٰ کرے تو اس صورت میں ان میں سخت جنگ وجدال کا اندیشہ ہے اور ممکن ہے کہ ہر ایک انکار کردے تو اس صورت میں اس عورت اور بچے پر سخت مصیبت ہوگی۔ اس کے بعد میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی ایسی تدبیر کرے کہ علوق کا احتمال ہی نہ رہے، مثلاً کوئی ایسی دوائی استعمال کرلی یا کوئی عورت سنِ ایاس کو پہنچ گئی یا مثلاً زانیوں کی کسی خاص جماعت میں محبت واُخوت ہوجائے جس سے احتمال بھی جنگ وجدال کا نہ رہے تو اس صورت میں زنا جائز ہوجانا چاہیے؟ کیونکہ وہ علت یہاں مرتفع ہے اور دوسرے کا حق متعلق نہیں تو اس میں کیا قباحت ہے؟ تو کیا زنا جائز ہوجائے گا؟ ہرگز نہیں، حالانکہ جو علت بتلائی گئی ہے، وہ مرتفع ہے۔

ہر ایک کو حکم کی علت دریافت کرنا صحیح نہیں

حاکم کی طرف سے کوئی حکم صادر ہو تو ہرگز اس (حکم) کی علت نہیں پوچھتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حکام کی عظمت ہے، اس لیے حجت نہیں کرتے۔ سو جب خدا تعالیٰ کے احکام کی علل دریافت کی جاتی ہے، اس سے تو شبہ پڑتا ہے کہ ان کے دل میں حق تعالیٰ کی عظمت نہیں ہے، غرض محکوم ہونے کی حیثیت سے علل دریافت کرنا عقلاً بیہودہ امر ہے، ہاں! طالب علمی کی حیثیت سے بغرض تحقیقِ فن مضائقہ نہیں، مگر وہ منصب صرف طالب علموں کا ہے۔

خیال تو کیجئے کہ کلکٹر کا منادی جب حکم کی اطلاع کرتا ہے تو کوئی علت نہیں پوچھتا، افسوس ہے، کیا علماء کو بھنگی سے بھی زیادہ ذلیل سمجھنے لگے ہیں؟ علماء درحقیقت منادی کرنے والے اور احکام کے ناقل ہیں، خود مُوجِد نہیں، اس لیے ان سے علتیں پوچھنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

احکامِ شرعیہ کی علتیں عوام کے سامنے بیان بھی نہ کرنا چاہیے

فرمایا: احکامِ شرعیہ کی علت عوام کے سامنے ہرگز بیان نہیں کرنی چاہیے، بلکہ ضوابط کی پابندی کرانی چاہیے، ورنہ خطرہ کا قوی اندیشہ ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے: جیسا کہ صاحب کلکٹر نے ایک مجرم کو کسی دفعہ کی بنا پر سزا کا حکم کردیا اور فوراً اس کی تعمیل ہوگئی، مگر وہ مجرم اس دفعہ کی علت ہرگز دریافت نہیں کرسکتا اور جرأت کرکے دریافت بھی کرلے گا تو کلکٹر اس کو ڈانٹ دے گا کہ ہم نہیں جانتے، بس قانون یہ ہے اور اگرچہ ہم علت جانتے بھی ہیں، مگر بتاتے نہیں (اور اگر اس کا شوق ہی ہو تو) سنو، اس کے لیے تعلیمِ فن کی ضرورت ہے، ہمارے پاس آکر ترتیب وار پڑھو، پھر اپنے وقت پر جو امر سمجھنے کا ہے، وہ سمجھ لیں اور خود آجائے گا، دریافت کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔

کیوں صاحب! کیا یہی انصاف ہے کہ حاکم دنیوی کا فیصلہ تو بسر وچشم مان لیں اور کچھ اعتراض

نہ کریں اور احکامِ شرعیہ پر سینکڑوں اعتراض کریں؟! بس معلوم ہوا کہ شریعت کی قدر اتنی بھی نہیں جتنی حاکمِ دنیوی کی ہے۔

اسرار وحِکَم کا فقہی حکم

نہ ان کا ماننا واجب ہے، البتہ ان میں سے بعض احکام ایسے ہوتے ہیں کہ کتاب وسنت کے اشارات سے ان کی تائید ہوجاتی ہے تو اس صورت میں ان کا قائل ہونا جائز ہے اور اگر کتاب وسنت کے خلاف ہو تو اس کا رد واجب ہے اور اگر کتاب وسنت سے نہ متأید ہوں، نہ اس کے خلاف ہوں تو اس میں جانبین کی گنجائش ہے۔

علت اور حکمت کا فرق

آج کل یہ مرض لوگوں میں ہے کہ وہ احکام کی علت تلاش کیا کرتے ہیں اور جب علت نہیں ملتی تو حکمت کو علت سمجھ کر اس کو جواب میں پیش کر دیتے ہیں، حالانکہ علت کی حقیقت ''ما یترتب علیہ الحکم'' ہے اور حکمت کی حقیقت ''ما یترتب علی الحکم'' ہے اور تعیینِ حکمت چونکہ اکثر جگہ نص سے نہیں محض امرِ قیاسی ہے، لہٰذا حِکَمِ مخترعہ میں مخالف جانب کا بھی قوی احتمال باقی رہتا ہے، پس اگر کسی وقت میں یہ حکمتِ مخترعہ مخدوش ہوجائے تو عِلَل کی نظر میں اس سے حکمِ خداوندی بھی مخدوش ہوجائے گا۔ علت ''ما یترتب علیہ الحکم'' کو کہتے ہیں اور حکمت خود ''مرتب علی الحکم'' ہوتی ہے تو دونوں جدا جدا ہیں۔

حکمت پر احکام کے مبنی نہ ہونے کی دلیل

۱- جو لوگ مصالحِ مخترعہ کو بناء احکامِ شرعیہ تعبُّدیہ کی قرار دیتے ہیں، ان کا رَد اس سے ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعریف میں فرماتے ہیں جب انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خرید کر آزاد کر دیا تھا: ''وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلٰى'' تو اس میں ان کے فعل کا سبب نفی اور استثناء کر کے منحصر فرما دیا ''اِبْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ'' میں، حالانکہ اس میں یہ بھی ایک مصلحت تھی کہ قومی ہمدردی ہے۔

۲- دوسری اس میں بڑی قباحت یہ ہے کہ اگر وہ دنیوی مصالح کسی دوسرے طریقے سے حاصل ہونے لگیں اور اسلام پر ان کے مرتب ہونے کی توقع نہ رہے تو چونکہ اسلام کو مقصود بالعرض رکھا ہے اور مصالحِ دنیوی کو مقصود بالذات، اس لیے نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کو چھوڑ کر دوسرے طریقے کو اختیار کرلیں گے۔

۳- تیسرے یہ مصالح ہیں تخمینی، اور تخمینات بہت آسانی سے مخدوش ہو سکتے ہیں تو اگر یہ کبھی

مخدوش ہو جائیں تو چونکہ حکمِ شرعی اس پر مبنی سمجھا گیا تھا، لہٰذا وہ حکم بھی مخدوش ہو جائے گا۔

منصوص حکمت بھی مدارِ حکم نہیں

حکمت سے حکم تعدی نہیں ہوتا، نہ حکم کا وجود وعدم اس کے ساتھ دائر ہوتا ہے اور یہ عدمِ دوران حکمتِ منصوصہ میں بھی عام ہے، جیسے طواف میں رمل، اس کی بناء ایک حکمت تھی، مگر وہ مدارِ حکم نہیں۔

علت وحکمت کا واضح فرق مع مثال اور احکامِ شرعیہ میں بیان کردہ علل کی حیثیت

احکامِ شرعیہ کے ساتھ جو کبھی مصلحت مذکور ہوتی ہے، وہ کبھی علت ہوتی ہے اور کبھی حکمت ہوتی ہے۔ علت کے ساتھ تو حکم وجوداً وعدماً دائر ہوتا ہے، لیکن حکم کے ساتھ دائر نہیں ہوتا، یعنی حکمت کے تبدُّل سے حکم نہیں بدلتا اور اس فرق کا سمجھنا یہ راسخین فی العلم کا خاصہ ہے۔ پس لحیہ کے مسئلہ میں حدیث پاک میں ''خالفوا المشرکین'' کا مقرون فرمانا بطورِ حکمت ہے، بطورِ علت کے نہیں، حرمت کا مدار تغیُّر یعنی صورت کا بگاڑنا ہے، نہ مخالفت۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ بعض احادیث میں جو یہ حکم آیا ہے وہ اس سے مطلق ہے، جیسا کہ ''لعن النبي صلى الله عليه وسلم المخنثين من الرجال'' میں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی حاکم رعایا سے کہے کہ دیکھو! قانون کو مانو، فلاں قوم کی طرح شورش مت کرو، تو اگر وہ قوم اتفاق سے شورش چھوڑ دے تو کیا اس حالت میں رعایا کو اس قوم کے ساتھ اس میں بھی مخالفت کرنا چاہیے، اس بنا پر کہ پہلے ان کی مخالفت کا حکم ہوا تھا؟

کتاب اللہ میں بیان کردہ علل کی حیثیت

قرآن میں جہاں کہیں حکم کے بعد لامِ غایت آیا ہے وہ علت نہیں ہے، حکمت ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس حکم پر یہ اثر مرتب ہوگا، یہ مطلب نہیں کہ حکم کی بنا اس پر ہے۔

اسرار وحکم کی تحقیق کرنے کی بابت قولِ فیصل

اس میں کوئی شک نہیں کہ اصل مدار احکامِ شرعیہ کے ثبوت کا نصوصِ شرعیہ ہیں، لیکن اسی طرح اس میں بھی شبہ نہیں کہ باوجود اس کے پھر بھی ان احکام میں بہت سے مصالح اور اسرار بھی ہیں اور گو مدار ثبوتِ احکام کا اُن پر نہ ہو، لیکن ان میں یہ خاصیت ضرور ہے کہ بعض طبائع کے لیے ان کا معلوم ہو جانا احکامِ شرعیہ میں مزید اطمینان پیدا ہونے کے لیے ایک درجہ میں معین ضرور ہے، گو اہلِ یقینِ راسخ کو اس کی ضرورت نہیں، لیکن بعض ضعفاء کے لیے تسلی بخش اور قوت بخش ہے۔ اسی راز کے سبب بہت سے اکابر وعلماء مثلاً: امام غزالیؒ وخطابیؒ وابن عبد السلامؒ وغیرہم کے کلام میں اس قسم کے معانی ولطائف پائے جاتے ہیں۔

جن احکام کی حکمتیں معلوم ہوجائیں، ان کو مبانی ومناشی احکام کا نہ سمجھے، بلکہ خود ان کو احکام سے ناشی سمجھے، ان شرائط کے ساتھ حکمتوں کے سمجھنے کا مضائقہ نہیں۔

سالم روش یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ احکام میں حکمتوں کا ہونا یقینی ہے، لیکن تعیین چونکہ شارع نے نہیں کی، اس لیے ہم بھی نہیں کرتے اور ہمارے امتثال کی بناءصرف حکمِ باری ہے، گو ہم کو حکمت معلوم نہ ہو، اگر یہ علوم مقصود ہوتے تو حضرات صحابہؓ ان کی تحقیق کے زیادہ مستحق تھے۔

ظن کے مختلف معانی

قرآن پاک کا نزول محاورات میں ہوا ہے اور محاورات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظن کے معنی صرف وہ نہیں جو ''ملاحسن'' وغیرہ میں مذکور ہیں۔قرآن ہی کے چند مقامات کو دیکھ کر میں یہ کہتا ہوں کہ محاورات میں ظن کے معنیٰ عام طور سے محض حکم کی جانبِ راجح کے ساتھ مختص نہیں، چنانچہ ایک مقام پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلاَّ عَلَى الْخَاشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ'' یہاں ظن سے مراد یقین ہے، کیونکہ لقاءرب کا یقینِ جازم واجب ہے اور ایک جگہ حق تعالیٰ نے قیامت کے متعلق کفار کا مقولہ نقل فرمایا ہے: ''اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ'' یہاں بھی ظن سے مراد معنیٰ اصطلاحی نہیں ہیں، کیونکہ کفار کو وقوعِ معاد کا ظنِ غالب وراجح بھی نہ تھا، وہ تو بالکل ہی منکر ومکذب تھے، چنانچہ خود قرآن میں ہے: ''بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ'' پس یہاں ظن سے مراد جانبِ مرجوح بھی مراد نہیں، کیونکہ ان کو تو قیامت کا احتمال بھی نہ تھا، ان سب موارد کو دیکھ کر میں یہ کہتا ہوں کہ محاورہ میں ظن کے معنی خیال کے ہیں، خواہ وہ خیال صحیح ہو یا باطل، قوی ہو یا ضعیف، اس کو پیش نظر رکھ کر تمام آیات کو دیکھئے! سب حل ہوجائیں گی اور کوئی اشکال نہ رہے گا، چنانچہ ''اِنَّ الظَّنَّ لَايُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا'' میں بھی ظن سے مراد مجرد خیال بلا دلیل ہے۔

ظن کی اصطلاحی تعریف اور اس کی حجیت

ظنِ اصطلاحی جو کہ مفید ہے وہ خیال مع الدلیل ہے، دلائلِ شرعیہ سے اس کا معتبر وحجت ہونا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ قرآن میں بعض آیات مجملہ ومشکلہ بھی ہیں، سب کی سب مفسر ومحکم ہی نہیں ہیں اور جب بعض آیات مجمل ومشکل بھی ہیں تو ان کی کوئی تفسیر قطعی نہیں تو ظنی ہوگی، اب اگر ظن مطلقاً غیر معتبر ہے تو آیاتِ مجملہ ومشکلہ بالکل متروک العمل ہوجائیں گی، حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔

ظن کے معتبر ہونے کا محل وموقع

ظن کا عقائد میں دخل نہیں، البتہ فقہیات میں ہے، کیونکہ فقہ میں ضرورت عمل کی ہے اور عقائد

میں کونسی گاڑی اَٹکی ہے، اس کو طالب علم یاد رکھیں۔

عقائدِ قطعیہ کے لیے ضرورت ہے دلیلِ قطعی کی جو ثبوتاً بھی قطعی ہو اور دلالۃً بھی قطعی ہو اور عقائدِ ظنیہ کے لیے دلیلِ ظنی کافی ہے، بشرطیکہ اپنے مافوق کے ساتھ معارض نہ ہو، ورنہ دلیل مافوق ماخوذ ہوگی اور یہ دلیل متروک ہوگی۔

ظنی ہونے کا مقتضا

ظنی ہونے کا تقاضا ہی یہ ہے کہ جانبِ مخالف کا اس میں شبہ رہتا ہے، اگر تمہیں شبہ ہے تو ہوا کرے، اس سے مسئلہ کی ظنیت کی تاکید وتقویت ہوتی ہے، ایسے شبہ سے کچھ حرج نہیں۔

حسنِ ظن کا آخری مرحلہ

منتہاءِ حسنِ ظن یہ ہے کہ خود اس کے فعل میں تاویل مناسب کر کے اس کو قواعدِ شرعیہ کے تابع بنادے، نہ یہ کہ شریعت میں تبدیلی کر کے شریعت کو اس کے تابع بنادے۔

ظن کے محمود و مذموم اور مقبول وغیر مقبول ہونے کا معیار

''اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا'' اہلِ علم کو اس مقام پر شبہ ہو جایا کرتا ہے کہ شریعت میں تو ظن کا اعتبار کیا گیا ہے، چنانچہ خبرِ واحد اور قیاس ظنی ہے، ظن وہ معتبر ہے جس کا استناد نص کی طرف ہے، چنانچہ خبرِ واحد جو ظنی ہے تو وہ اصل ہی میں ظنی الثبوت نہیں ہے، محض اس کی سند میں ظن عارض ہو گیا ہے، ورنہ بحیثیت رسول ہونے کے وہ فی نفسہٖ قطعی ہے۔ اسی طرح قیاس گو اصل ہی میں ظنی ہے، لیکن وہ خود مُثبِت نہیں ہے، بلکہ مُظہِر ہے اور مُثبِت تو نص ہے اور قیاس اس کی طرف مستند ہے۔ اور جس ظن پر ملامت ہے، اس سے مراد وہ ظن ہے جس کا مستند نص نہ ہو، محض تخمین اور رائے اس کا منشا ہو۔ نرا گمان جو دلائلِ شرعیہ سے ماخوذ نہ ہو وہ مُثبِت نہیں، تاوقتیکہ اس ظن کا کوئی مستند شرعی ہو، دین کے بارے میں کارآمد نہیں۔

دین کی قید اس لیے لگائی ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ کسی امر میں کوئی گمان مفید نہ ہو، چنانچہ طب میں کہ وہ دین کا امر نہیں، ظن معتبر ہے۔ البتہ امرِ دنیوی میں بھی جہاں جس ظن کی ممانعت ہے، وہاں اس پر عمل جائز نہیں۔ مقصود یہ کہ دین کے بارے میں گمان اصلاً کوئی چیز نہیں، خواہ وہ گمان کرنے والا کتنا ہی بڑا ذہین ہو اور عاقل ہو۔ دین کے بارے میں جب تک دلیلِ شرعی نہ ہوگی، اس کا خیال معتبر نہ ہوگا۔

ظن کی اقسام واحکام

ظن کی کئی قسمیں ہیں: ایک واجب، جیسے ظنِ فقہی غیر منصوص میں اور حسنِ ظن مع اللہ اور دوسرا مباح جیسے ظن اُمورِ معاش میں اور ایسے شخص کے ساتھ بدگمانی کرنا جس میں علانیہ علامات فسق کے پائے

جاتے ہیں، جیسے شراب خانوں میں اور فاحشہ عورتوں کی دکانوں میں کسی کی آمد و رفت ہوا اور اس پر فسق کا گمان ہو جائے، جائز ہے، مگر یقین نہ کرے۔ اسی طرح سوءِ ظن غیر اختیاری ہو، اس کے مقتضا پر عمل نہ ہو، اس میں بھی گناہ نہیں، بشرطیکہ حتی الامکان اس کو دفع کرے۔ اور تیسرا حرام، جیسے الٰہیات ونبوات میں بلا دلیلِ قاطع، کلامیات وفقہیات میں خلافِ دلیلِ قاطع ظن کرنا یا جس میں علامات فسق کے قوی نہ ہوں، بلکہ ظاہراً اصلاح کے آثار نمودار ہوں، اس کے ساتھ سوءِ ظن کرنا یہ حرام ہے۔

معاملات میں سوءِ ظن کا حکم

سوءِ ظن کے مقتضا پر عمل کرنا مظنون بہ کے حق میں تو حرام ہے، جیسے اس کی تحقیر کرنا، اس کو ضرر پہنچانا (لیکن) خود ظان کو اپنے حق میں جائز ہے، بایں معنیٰ کہ اس کی مضرت سے خود بچے۔

فرمایا کہ: معاملات میں تو سوءِ ظن چاہیے اور اعتقاد میں حسنِ ظن۔ اور معاملات میں سوءِ ظن سے مراد ہے کہ جس کا تجربہ نہ ہو چکا ہو، اس سے لین دین نہ کرے، روپیہ نہ دے تو اس معنی کو معاملات میں سوءِ ظن رکھے، باقی اعتقاد میں سب سے حسنِ ظن رکھے، کسی کو برا نہ سمجھے۔

قرائن کے معتبر ہونے کی دلیل

حدیث: ''نهى طعام المتبارئين'' میں حضور ﷺ نے فخر کرنے والوں کے کھانے سے منع فرمایا ہے، حالانکہ زبان سے (فخر کا) کوئی بھی اقرار نہیں کرسکتا، پس اگر قرائن وغیرہ سے یہ بات نہیں معلوم ہوسکتی تو اس حدیث پر عمل کیوں کر ہوسکتا ہے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرائن وغیرہ سے فخر معلوم ہو جاتا ہے اور اس کا اعتبار کرنا جائز ہے۔

عملیات، جادو، جنات، نجومی وغیرہ سے حاصل شدہ علم کا شرعی درجہ اور اس کا حکم

سب کا قاعدہ مشترکہ یہی ہے کہ جس امر کے اثبات کا شرع میں جو طریق ہے، جب تک اس طریق سے وہ امر ثابت نہ ہو، اس کا کسی طرف منسوب کرنا جائز نہیں اور اپنے محل میں ثابت ہو چکا ہے کہ ان طرقِ اثبات میں شریعت نے الہام یا خواب یا کشف کو معتبر وحجت قرار نہیں دیا تو ان کی بنا پر کسی کو چور یا مجرم سمجھنا حرام اور سخت معصیت ہے۔

جو ذرائع شریعت کے نزدیک کوئی درجہ بھی نہیں رکھتے، ان پر حکم لگانا کس قدر سخت گناہ ہوگا؟ جیسے حاضرات کرنا چور کا نام نکالنے کے لیے یا لوٹا گھمانا یا آج کل جو عمل مسمریزم شائع ہوا ہے، یہ تو بالکل مہمل اور خرافات ہی ہیں۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ کسی سحر یا کسی جن کے واسطے سے یا کسی نجومی یا پنڈت کے واسطے سے کسی

چیز کا یقین کر لینا، خصوصاً جب کہ اس خبر سے کسی بری کو متہم کر دیا جائے، ایسا شدید حرام ہے کہ کفر کے قریب ہے، ایسی ضعیف یا باطل بناؤں پر کسی کو چور سمجھ جانا اور کسی طرح کا شبہ کرنا جائز نہیں، مسلمانوں کے لیے اصل مدار علم وعمل ہے، تو دیکھ لو! جب شریعت نے ان کی دلالت کو حجت نہیں کہا، تم کیسے کہتے ہو؟

تصرف، سحر، عملیات وتعویذات کا حکم

تصرف کا شرعی حکم یہ ہے کہ فی نفسہ مباح وجائز ہے، پھر غرض ومقصود کے تابع ہے، یعنی اگر اس کا استعمال کسی غرضِ محمود کے لیے کیا جائے تو یہ محمود سمجھا جائے گا، جیسے مشائخ صوفیہ کے تصرفات اور اگر کسی مذموم مقصد کے لیے کیا جائے، پھر مذمت وکراہت میں جو درجہ اس کی غرض اور مقصد کا ہوگا، اسی کے مطابق اس کی مذمت وکراہت میں کمی بیشی ہوگی۔ سحر میں اگر کلماتِ کفریہ ہوں مثل بہ استعانتِ کواکب وغیرہ تب تو کفر ہے، خواہ اس سے کسی کو ضرر پہنچایا جائے یا نفع پہنچایا جائے۔ اور اگر کلمات مفہوم نہ ہوں تو بوجہ احتمال کفر ہونے کے واجب الاحتراز ہے اور یہی تفصیل ہے تمام تعویذ گنڈوں اور نقش وغیرہ میں۔

عمل باعتبار اثر کے دو قسم کے ہیں: ایک قسم یہ کہ جس پر عمل کیا جائے، وہ مسخر اور مغلوب المحبت ومغلوب العقل ہو جائے، ایسا عمل اس مقصود کے لیے جائز نہیں جو شرعاً واجب نہ ہو، جیسے نکاح کرنا کسی معین مرد سے کہ شرعاً واجب نہیں، اس لیے اس کے لیے ایسا عمل جائز نہیں۔ دوسری قسم یہ کہ صرف معمول کو اس مقصود کی طرف توجہ بلا مغلوبیت ہو جائے، پھر بصیرت کے ساتھ اپنے لیے مصلحت تجویز کرے، ایسا عمل مقصود کے لیے جائز ہے، اس حکم میں قرآن وغیر قرآن مشترک ہیں۔ رقیہ جائز تو ہے، مگر افضل یہی ہے کہ نہ کیا جائے۔

بے خودی یا خواب کا حکم

خواب یا بے خودی حجتِ شرعیہ نہیں، اس سے نہ غیر ثابت' ثابت ہو سکتا ہے، نہ راجح' مرجوح، نہ مرجوح' راجح، سب احکام اپنے حال پر رہیں گے، البتہ اتنا اثر لینا شرع کے موافق ہے کہ جانبِ احوط کو پہلے سے زیادہ لے لیا جائے۔ خواب پر مسائل میں اعتماد کرنا جائز نہیں۔

خوابوں کا کیا اعتبار؟ اول تو خود خواب ہی کا حجت ہونا ثابت نہیں، پھر اس کی صحیح تعبیر کا سمجھ میں آ جانا ضروری نہیں، خواب کسی حالت کی علت نہیں، ایک قسم کی علامت ہے اور علامت کبھی صحیح ہوتی ہے اور کبھی غلط، اس لیے جس چیز کی وہ علامت ہے، اس کی حقیقت دیکھنی چاہیے۔

کشف کا حکم

(بہت سے امور) جو کہ صرف مکشوف ومشہور ہیں، جن کے حجت نہ ہونے پر دلائلِ شرعیہ موجود

ہیں، اس حالت میں ان تفصیلات کا یا ان کے معانی کا اعتقادِ جازم رکھنا یا اس کے مقتضا پر عمل کو لازم سمجھنا یا ان کو مقصود بالذات یا مقصودیت کے لیے شرط سمجھنا، جیسا کہ اس وقت مشاہد ہے، یقیناً غلو فی الدین ہے۔

کشف اگر شرع سے متصادم نہ ہو تو اس میں دونوں امر محتمل ہیں، صحت بھی غلط بھی، خواہ اپنا کشف ہو، خواہ اپنے اکابر کا، بالخصوص جب کہ وہ کشف ذات وصفات سے متعلق ہو، جس میں ظنیات سے حکم کرنا محلِ خطر ومحتملِ معصیت ہے۔

کشفِ قلوب کی دو قسمیں اور مسائلِ کشفیہ کا حکم

مسائلِ کشفیہ کے لیے یہی غنیمت ہے کہ وہ کسی نص سے متصادم نہ ہوں، یعنی کوئی نص ان کی نافی نہ ہو۔ باقی اس کی کوشش کرنا کہ نص کو ان کا مثبت بنایا جائے، اس میں تفصیل ہے، وہ یہ ہے کہ: اگر نص اس کی محتمل ہو تو درجۂ احتمال تک اس کا رکھنا غلو تو نہیں، مگر تکلف ہے اور اس کو درجۂ احتمال سے بڑھا دینا غلو ہے۔ اور اگر وہ محتمل بھی نہ ہو تو اس کا دعویٰ کرنا احتمالاً یا جزماً صریح تحریف ہے نص کی۔ البتہ اگر وہ دعویٰ بطور تفسیر یا تاویل کے نہ ہو، محض بطور علمِ اعتبار کے ہو تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ وہ حکم اگر کسی اور نص سے ثابت ہو تو وہ اعتبار داخلِ حدود ہے اور اگر وہ کسی اور نص سے ثابت نہ ہو تو وہ بھی تکلف ہے۔

تتمہ: کشفِ قلوب کی دو قسمیں ہیں: ایک بالقصد جس میں دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر اس کے خطرات پر اطلاع حاصل کی جاتی ہے، یہ جائز نہیں، تجسس ہے، کیونکہ تجسس اس کو کہتے ہیں کہ جو باتیں کوئی چھپانا چاہتا ہو، اس کو دریافت کرے۔ دوسری صورت یہ کہ بلاقصد کسی کے مافی الضمیر کا انکشاف ہو جائے اور یہ کرامت ہے۔

فراست کا حکم

''اتقوا فراسة المؤمن'' اس حدیث میں اصل ہے فراست کی اور وہ ایک قسم کا کشف ہے اور وہ بھی مثلِ کشف کے حجتِ شرعیہ نہیں۔

علمِ قیافہ کی حقیقت اور اس کا حکم

فرمایا: ایک مرتبہ مولانا محمد یعقوبؒ نے علمِ قیافہ کا حاصل بیان کیا تھا کہ باطنی نقص پر حق تعالیٰ کسی ظاہری ہیئت کو علامت بنا دیتے ہیں، تا کہ ایسے شخص سے احتیاط ممکن ہو، یہ حاصل ہے علمِ قیافہ کا، مگر ایسے اُمور وعلامات کوئی حجتِ شرعیہ نہیں۔

الہام اور کشف کا حکم

مکاشفہ تو حجت کے درجہ میں بھی نہیں ہے، بس اتنا ہے کہ اگر مکاشفہ شرع کے خلاف نہ ہو تو وہ خود

صاحبِ کشف یا جو صاحبِ کشف کے اتباع کا التزام کرے اس کو عمل کر لینا جائز ہے اور کسی قدر مؤکد ہے۔ مؤکد ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اگر عمل نہ کرے گا تو ضرور کسی ضررِ دنیوی میں مبتلا ہوگا، نہ کہ اُخروی میں۔ فرمایا کہ: اِلہام کی مخالفت سے بھی دنیا میں مواخذہ ہوجاتا ہے، مثلاً کسی بیماری میں مبتلا ہوجائے یا کوئی اور آفت آجائے، مگر آخرت میں نہیں ہوتا، کیونکہ الہام حجتِ شرعیہ نہیں، اس لیے اس کی مخالفت معصیت نہیں، جس سے آخرت میں مواخذہ ہو۔ اور وحی کی مخالفت سے آخرت میں بھی مواخذہ ہوتا ہے۔

حدیثِ ضعیف کا حکم

حدیثِ ضعیف حسبِ تصریح اہلِ علم کسی حکمِ شرعی کے لیے مُثبِت نہیں ہوسکتی۔

ادراک کا حکم

شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک شخص ہمارے زمانہ میں ایسا صاحبِ فراست ہے کہ صرف صورت دیکھ کر نام بتلا دیتا ہے، مجھے بھی حق تعالیٰ نے اتنی فہم عطا فرمائی ہے کہ طرزِ گفتگو سے مجھے انداز طبیعت کا معلوم ہوجاتا ہے، البتہ ایسا اِدراک بدون دلیلِ شرعی کے حجت نہیں۔

''شَرَائِعُ مَنْ قَبْلَنَا'' کا حکم

اگر یہ شبہ ہو کہ ''شَرَائِعُ مَنْ قَبْلَنَا'' ہمارے اوپر حجت نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ''شَرَائِعُ مَنْ قَبْلَنَا'' کو اگر ذکر فرما کر اُن پر نکیر نہ فرمائی گئی ہو تو ہمارے لیے بھی حجت ہیں۔

اس قاعدہ اصولیہ میں ایک قید مشہور ہے کہ نقل کر کے نکیر نہ کیا گیا ہو، اس میں اتنی تنبیہ ضروری ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اسی مقام پر نکیر ہو، بلکہ کسی نص میں بھی نکیر ہونا کافی ہے، ورنہ تبریۂ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جو اس شاہد کا منقول قول منقول ہے: ''اِنْ کَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ'' اور اس مقام پر نکیر نہیں ہے تو لازم آتا ہے کہ ہماری شریعت میں بھی حجت ہو، اس سے ان لوگوں کا بھی جواب ہوگیا جو سجدۂ ملائکہ واخوانِ حضرت یوسف علیہ السلام سے جوازِ سجدۂ تحیۃ پر استدلال کرتے ہیں۔ وجہ جواب ظاہر ہے کہ دوسری نصوص میں نکیر موجود ہے۔ وفی المقام تفریعان لطیفان یتعلقان بقصة موسٰی علیه السلام مبنیان علی کون ما قص الله ورسوله علینا من نکیر حجة لنا، أحدهما إباحة مال الحربي برضاه ولو بعقدٍ فاسدٍ، فإن استیجار الأم لإرضاع الابن عقدٌ فاسدٌ، وهو مذهب الحنفیة.

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

علومِ حدیث کی تطبیق میں اِفراط وتفریط کے مظاہر

(پہلی قسط)　　افادات: مولانا محمد عبدالمالک (ڈھاکہ، بنگلہ دیش)
تلخیص وترتیب جدید: مولانا محمد یاسر عبداللہ (اُستاذِ جامعہ)

تمہید

علومِ حدیث، امتِ مسلمہ کی درخشاں علمی تاریخ کا گلِ سرسبد ہیں، محدثین نے ان علوم پر جو محنتیں صرف کی ہیں، ان کی بدولت اسباب کے درجے میں یہ علوم ذخیرۂ حدیث کی حفاظت کا ذریعہ ثابت ہوئے، یوں حفاظتِ قرآنی کے ضمن میں حفاظتِ حدیث کا خدائی وعدہ پورا ہوا۔ محدثین کی کاوشیں بلاشبہ عقل ونقل کے پیمانوں پر پورا اُترتی ہیں، اور مسلم عقلیت کی تشکیل میں بھی ان کا اہم کردار ہے۔ محققین کا کہنا ہے کہ ان علوم کا تعلق محض ذخیرۂ حدیث سے نہیں، بلکہ نقل وروایت کے ہر میدان میں یہ علوم، کسوٹی کی حیثیت رکھتے اور اصولِ نقل فراہم کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ سے وابستہ طبقات اگر ان اصولِ نقل کو برتنے لگیں تو بہت سے ''حقائق اور انکشافات'' منظرِ عام پر آنے سے قبل ہی اپنا وجود کھو بیٹھیں گے۔ عام لوگ روزمرہ کی ''سنسنی پھیلاتی خبروں'' کی چھان پھٹک میں انہیں برتنا شروع کردیں تو انسانی ذہنوں میں آئے بہت سے بھونچال، تباہی پھیلانے سے پہلے ہی دم توڑ جائیں، بلاشبہ یہ اصول ہردم تازہ دم اور سبک خرام ہیں اور رہیں گے، ان شاء اللہ!

آمدم برسرِ مطلب! علومِ حدیث کے مفید اور ثمر آور ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ بڑھیا سے بڑھیا شے کا ناروا استعمال اس کی افادیت کو ٹھیس پہنچاتا اور افادیت کی بجائے اُلٹا نقصان کا باعث بن جایا کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال علومِ حدیث کا بھی ہے، ناپختہ فکری کے ساتھ علمیت کا سودا اگر دماغ میں سماجائے تو انسان مفید غذا کو زہرناک بناڈالتا ہے، اور علمی اصولوں کو ہی بنیاد بناکر علمی روایت کو ڈھاتا چلا جاتا ہے، طُرفہ یہ کہ ایسی ذہنیتیں اپنے ناقص کاموں کو علمی کارنامہ باور کراتی ہیں اور خود پر نازاں بھی رہتی ہیں: ''ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا!''۔

علومِ حدیث کی تطبیق میں اِفراط وتفریط کے جومظاہر، معاصر علمی اُفق پر دکھائی دیتے ہیں، اور ان کے نتیجے میں سلف واکابر کے تئیں بے اعتمادی کی جیسی فضا بن رہی ہے، سنجیدہ اہلِ علم اس تکلیف دہ منظر نامے کا درد قلب وجگر میں محسوس کرتے اور اپنے مستفیدین ومتعلقین کو اس سے باخبر رکھنے اور درست راہ پر گامزن رہنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔

پیشِ نظر مضمون اسی نوعیت کے ایک علمی محاضرے کی تحریری صورت گری ہے، محاضرِ محترم حضرت مولانا محمد عبد المالک صاحب مدظلہم (رئیس شعبہ ''تدریب في علوم الحدیث'' مرکز الدعوة الإسلامیة، ڈھاکہ، بنگلہ دیش) علومِ حدیث وفقہ اسلامی کے طلبہ کے لیے موجودہ دور کی مغتنم شخصیت ہیں، انہیں یہ سعادت حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں متعدد نابغۂ عصر ہستیوں سے استفادہ کا زرّیں موقع عنایت فرمایا۔ جامعہ علومِ اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن سے درسِ نظامی کی تکمیل کے بعد انہوں نے دو برس شعبہ تخصصِ علومِ حدیث میں برصغیر کے نامور محقق عالم حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی تربیت کے سائے تلے گزارے، اس دوران نامور مناظر ومحقق عالم مولانا امین صفدر اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مستفید ہوتے رہے، بعد ازاں جامعہ دارالعلوم کراچی کے شعبہ تخصص فی الافتاء میں ڈھائی برس تک محدثِ فقیہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم سے فیض یاب ہوتے رہے، اور پھر عالمِ عربی کے بلند پایہ محقق ومحدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوکر لگ بھگ دو سال تک ان کے متفرق علمی امور میں معاونت کرتے اور ان سے مستفیض ہوتے رہے، اس دوران بیس سے زائد کتب ورسائل کی تالیف وتحقیق میں ان کی رفاقت کا شرف حاصل رہا۔ مذکورہ بالا اہلِ علم میں سے ہر ایک اس پائے کے ہیں کہ محض کسی ایک سے انتساب واستفادہ بھی سرمایۂ افتخار ہے، پھر جنہیں ان سبھی سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہا ہو، ان کی سعادت مندی میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟!

کچھ عرصہ قبل مولانا مدظلہم کی کتاب ''محاضرات علوم الحدیث'' (شائع شدہ از مرکز الدعوة الإسلامیة، ڈھاکہ، بنگلہ دیش) طبع ہوئی، اور سال بھر میں اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کتاب میں ''مقدمة ابن الصلاح'' کی ابتدائی بارہ انواع سے متعلق ان کے محاضرے قلم بند کرکے ترتیب دیے گئے ہیں۔ پیشِ نظر مضمون کا انتخاب اسی کتاب سے کیا گیا ہے۔ مولانا مدظلہم نے اس محاضرہ میں علومِ حدیث کی تطبیق میں افراط وتفریط کے مظاہر اور ان کے نتائج کے تعلق سے پُرمغز گفتگو فرمائی ہے، اور اس ضمن میں بہت سے علمی دقائق، مفید نکات، پرلطف چٹکلے اور دلچسپ واقعات بھی آگئے ہیں، علومِ حدیث کے طلبہ کے لیے یہ سب کچھ حد درجہ مفید ہے۔ چونکہ وطنِ عزیز میں تاحال اس کتاب کی اشاعت نہیں ہوسکی، اور کتاب، عام طلبہ واہلِ علم کی دسترس میں نہیں، اس بنا پر بندہ نے اس محاضرے کا انتخاب کرکے کسی معنوی تغیر کے بغیر قدرے تلخیص کی، اور لفظی وتعبیری نوک پلک سنوار کر اس میں تحریری رنگ بھرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے، نیز حسبِ ضرورت

عبارات کا ترجمہ اور ہلکی پھلکی تخریج کی ہے، اور بعد ازاں اطمینان کے لیے اسے حضرت مولانا مدظلہم کی خدمت میں پیش کر کے اُن کی اجازت سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ مضمون، حدیث کے طلبہ و اہلِ علم کے لیے علومِ حدیث کی تطبیق کے تعلق سے خضرِ راہ ثابت ہوگا، اور ان کے قلوب میں اصل کتاب کے مطالعہ کا اشتیاق بڑھنے کا ذریعہ ثابت ہوگا، رہا کتاب کے حصول کا معاملہ تو سچ ہے کہ ''جو یندہ یابندہ''۔ (از مرتب)

علومِ حدیث سے متعلق ایک اہم بحث

علومِ حدیث سے متعلق مباحث میں سے ایک اہم بحث ''وجوہ الإفراط والتفریط في استخدام علوم الحدیث'' (یعنی علومِ حدیث کی تطبیق میں افراط و تفریط کے مظاہر) ہے۔

اِفراط: یعنی حدود کا خیال نہ رکھنا، اپنے مقام سے تجاوز کرنا، اور بے موقع استعمال کرنا۔

تفریط: یعنی کسی شے کا حق ادا نہ کرنا، اور جہاں اس کا خیال رکھنا ضروری ہے، وہاں خیال نہ رکھنا۔

افراط و تفریط ہر چیز میں مذموم ہے، طلبہ کرام کے لیے علومِ حدیث میں جن مباحث کی تدریب ضروری ہے، ان میں سے ایک اہم بحث یہ بھی ہے کہ وہ علومِ حدیث کا معتدل اور صحیح تطبیق و استعمال سیکھیں۔ ذیل میں اس حوالے سے چند اہم نکات پیش کیے جائیں گے۔

علومِ حدیث کی تطبیق میں مظاہرِ تفریط

بہت سے لوگوں کا یہ ذہن بنا ہوا ہے کہ یہ علم صرف نمونہ، برکت یا آثارِ قدیمہ کی طرح ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ محض اصطلاحی علم ہے، جس کو ایک مرتبہ نظر سے گزار لینا چاہیے، یا چوں کہ اس کا تعلق حدیث سے ہے، اس لیے برکت کی نیت سے پڑھ لینا چاہیے، یا چونکہ ہمارے بزرگ اسے پڑھتے پڑھاتے آئے ہیں، اس لیے گویا آثارِ قدیمہ کی مانند اس کا محض تذکرہ ہو جائے تو کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب دل میں یہ تصور ہوگا تو عملاً کیا حال ہوگا؟! چنانچہ تطبیقی میدان میں آپ کو اس علم کا نام بھی نظر نہیں آئے گا، یا صرف اس قدر کہ برکت کا حصول ہو جائے، إلا ماشاء الله.

علومِ حدیث کی تطبیق کے میدان

علومِ حدیث کی تطبیق کے پانچ بڑے میدان ہیں:

① - احادیثِ ضعیفہ ② - احادیثِ موضوعہ

③ - مختلف فیہا مسائل ④ - کتبِ حدیث کا درس اور شروحِ حدیث کا مطالعہ۔

⑤ - منکرینِ حدیث اور مستشرقین کا رد۔

①،②: احادیثِ ضعیفہ وموضوعہ کے بارے میں تفریط

اس اہم میدان میں علومِ حدیث کے اصولوں کو کام میں لانا چاہیے، لیکن بعض طلبہ ومدرسین اور بہت سے واعظین وخطباء کے حالات سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ گویا وہ یہ تہیہ کیے ہوئے ہیں کہ غلطی سے بھی انہیں ہاتھ نہیں لگانا، بلاہچکچاہٹ موضوع اور منکر روایات بیان کی جاتی ہیں، اور کان پر جوں بھی نہیں رینگتی، اگر متوجہ کیا جائے تو اس بارے میں ان کے مختلف بہانے ہوتے ہیں، اور ایسا لگتا ہے کہ یہی حیلے بہانے ان کے اصول ہیں۔

موضوع اور بے سرو پا روایات بیان کرنے کے چند بہانے

❶- ایک بہانہ یہ ہے کہ بزرگوں کی کتابوں میں کوئی حدیث مل جائے تو اسے لے لینا چاہیے، مثلاً: کوئی حدیث ''إحیاء علوم الدین'' میں مل جائے یا تصوف کی کسی اور کتاب میں مل جائے تو اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں، حالانکہ اصولی طور پر عصرِ روایت کے بعد کی معلّق روایات (جن روایات کی سند کی ابتدا سے راوی ساقط ہوں) کے حوالے تلاش کرنا، اور پھر ان کی سندوں کی تحقیق کرنا بالاجماع فرض ہے، مرسل روایات کو قبول کرنے والوں کے نزدیک بھی یہ عمل ضروری ہے۔ (ملاحظہ فرمایئے: ظفر الأماني، ص: ٣٤١ ـ ٣٤٤؛ الأجوبة الفاضلة، ص: ٣١ ـ ٣٤، المدخل إلی علوم الحدیث الشریف، ص: ١٠٧ ـ ١١٢)

❷- دوسرا بہانہ بعض لوگوں نے یہ ایجاد کیا ہے کہ فلاں روایت لفظاً اگرچہ موضوع ہے، لیکن معناً صحیح ہے، اس لیے اسے حدیث کے طور پر بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، نعوذ باللہ! مثلاً: کہتے ہیں کہ ''علماء أمتي کأنبیاء بني إسرائیل'' (میری امت کے علماء، بنی اسرئیل کے انبیاء کی مانند ہیں)، اس روایت کا معنی درست ہے، اور چونکہ روایت بالمعنی بالاتفاق جائز ہے، اس لیے گویا یہ بھی حدیث ہے، سبحان اللہ العظیم! حالانکہ کسی روایت کا مدعا صحیح ہونے اور اس کے مروی بالمعنی ہونے کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے، اس نکتے کی مزید وضاحت کے لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی ''لسان المیزان'' اور سیوطی رحمہ اللہ کی ''ذیل الموضوعات'' دیکھیں۔ یہ اجماعی قاعدہ ہے کہ صرف اس بنا پر کسی بات کو حدیث نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حق وصواب ہے، بلکہ حدیث کہنے کے لیے دو شرطیں ہیں: ١- بات کا حق ہونا۔ ٢- نسبت ثابت ہونا۔ علاوہ ازیں مذکورہ روایت کے بارے میں یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں کہ اس کا مدعیٰ درست ہے، ''لیس بحدیث'' (بزبان بنگلہ) نامی کتاب میں ہم نے اس کی مفصّل تحقیق ذکر کی ہے۔

❸- تیسرا بہانہ یہ گھڑلیا گیا ہے کہ فنی طور پر گو حدیث صحیح نہ ہو، لیکن کشف سے صحت معلوم ہو تو حدیث کو بیان کیا جاسکتا ہے، جب کہ یہ مسلّمہ اصول ہے کہ کشف والہام اور خواب ومنام، علمی وعملی امور میں حجت نہیں ہیں۔

❹- اس بات کا بھی سہارا لیا جاتا ہے کہ فضائل میں ضعیف حدیث قابلِ قبول ہے، اس لیے فضائل

میں روایت کو جانچنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں، بلکہ منکر یا موضوع سب روایتیں فضائل میں چل جاتی ہیں، حالانکہ فضائل میں جو ضعیف احادیث قابلِ قبول ہیں، ان سے موضوع، مطروح، واہی اور منکر المتن روایات بالاجماع مستثنیٰ ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ آج کل عوام صرف موضوع حدیثیں بیان ہی نہیں کرتے، بلکہ احادیث گھڑتے بھی ہیں، لیکن ان کو علم بھی نہیں ہوتا، اور لاشعوری طور پر وضعِ حدیث کے گناہ کا شکار ہوجاتے ہیں۔ مثلاً: کسی بزرگ کی بات کو بے دھڑک حدیث بنادیا، یا کوئی بھی بات اچھی لگی، تو کہہ دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے۔ تساہل کا یہ عالم ہے کہ بعض لوگ، موضوع روایتیں مزے لے کر بیان کرتے ہیں اور جب متوجہ کیا جائے تو سکون سے کہہ دیتے ہیں کہ: ’’ہمیں تو علم نہیں تھا کہ یہ روایت ’موضوع‘ ہے!!‘‘ گویا جس روایت کے موضوع ہونے کا علم نہ ہو، اسے بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں! اسے کہتے ہیں: ’’عذرِ گناہ بدتر از گناہ‘‘۔ ایسے لوگوں سے ادب کے ساتھ کہا جائے کہ کیا آپ کو یہ علم ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، یا حسن ہے، یا قابل بیان ہے؟ اگر یہ بھی معلوم نہیں تو پھر کیوں بیان کررہے ہیں؟ حدیث بیان کرنے کے لیے تو یہ ضروری ہے کہ اس کے صحیح، یا حسن، یا ضعیفِ صالح للعمل والروایۃ ہونے کا علم ہو، شریعت نے تو یہ اصول طے کیا ہے:

’’اتقوا الحديث عني إلا ما علمتم.‘‘ (سنن الترمذي: كتاب التفسير، باب ما جاء في الذي يفسر القرآن برأيه. المسند للإمام أحمد، رقم الحديث: ٢٦٧٥، عن ابن عباسؓ)

یعنی ’’میری نسبت سے جس بات کا حدیث ہونا معلوم ہو، صرف وہی بیان کرو۔‘‘

یہ بات درست نہیں کہ جس روایت کے موضوع ہونے کا علم نہ ہو، اسے بیان کرسکتے ہیں، اس طرح تو معاملہ بہت آسان ہوجائے گا، لوگوں کے جی میں جو کچھ آیا کہتے رہیں گے اور استفسار پر یہ کہہ دیں گے کہ ہمیں تو اس کے موضوع ہونے کا علم نہیں تھا۔ بہرحال یہ بھی ایک بہانہ ہے کہ مجھے اس روایت کے موضوع ہونے کا علم نہیں تھا، میں نے تو کسی کتاب میں پڑھی تھی، اس لیے بیان کردی۔ اس بہانے کی بنیاد پر احادیث کے بیان میں تساہل سے کام لیا جاتا ہے۔ ان حیلوں بہانوں پر مدلل اور باحوالہ نکیر ’’مركز الدعوة الإسلامية‘‘ (ڈھاکہ، بنگلہ دیش) سے ’’الأحاديث الشائعة الموضوعة‘‘ سے متعلق شائع شدہ اہم کتاب ’’ليس بحديث‘‘ (بزبانِ بنگلہ) کی ابتدا میں بندہ کے مقدمہ میں موجود ہے۔

③-مختلف فیہا مسائل میں تفریط

مختلف فیہا مسائل کے میدان میں بھی علومِ حدیث کے اصولوں کو حزم واحتیاط اور بصیرت کے ساتھ منطبق کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن یہاں بھی عملاً یہ فیصلہ کرلیا گیا ہے کہ علومِ حدیث کے اصولوں کو منطبق نہیں کرنا ہے، بہت کم لوگ مختلف فیہا مسائل میں سلیقے کے ساتھ دلائل بیان کرتے ہیں۔ عام طور پر پیشِ نظر یہ

ہوتا ہے کہ کسی بھی طریقے سے مخالف کا جواب دے دیا جائے، اگر وہ کسی اور طریقے سے ہوگیا تو بس کام ختم، اگر ضرورت پیش آجائے تو علومِ حدیث کا بھی کوئی اصول بیان کردیا جائے، لیکن مقصد بنا کر ان مباحث کا علمی حق ادا کرنے میں انتہائی تساہل برتا جاتا ہے، اور عمومی طرزِ عمل سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا بذاتِ خود ہمیں یہ علم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اگر کوئی مخالفت کرے تو اسے خاموش کرنے کے لیے کچھ معلومات حاصل کرلینا کافی ہے۔

④-درسِ کتبِ حدیث ومطالعہ شروحِ حدیث

علمی امور میں یہ سب سے بڑا عملی میدان ہے جس میں علومِ حدیث کو منطبق کرنا چاہیے، لیکن افسوس کہ اس طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ اکثر طلبہ نے علی وجه البصیرة فیصلہ کرلیا ہے کہ علومِ حدیث کو ہاتھ نہیں لگانا، گویا یہ شجرہ ممنوعہ ہے، إلا ما شاء الله تعالیٰ، کچھ طلبہ ضرور ایسے ہیں، جو اہتمام کرتے ہیں، اور ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ ان کو مزید توفیق سے نوازے۔ عمومی طور پر صورتحال یہ ہے کہ چوں کہ ''مشكاة المصابيح'' کے بعد اگلے سال حدیث کی بہت سی کتابیں پڑھنی ہوتی ہیں، اس لیے ''مشكاة المصابيح'' کے درجہ میں ایک کتاب ''شرح النخبة'' (نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر للحافظ ابن حجر رحمه الله) پڑھ لیتے ہیں، لیکن کیا دورۂ حدیث کے پورے سال میں کبھی طالب علم کو ''شرح النخبة'' کھول کر دیکھنے کی نوبت آتی ہے؟! یہ نظریہ بن گیا ہے کہ علومِ حدیث ایک مستقل فن ہے، اسے حدیث سے الگ رکھنا چاہیے، اس کا اپنا مقام ہے، اور اسے ''شرح النخبة'' میں پڑھ لیا گیا ہے، بلکہ ''شرح النخبة'' پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، بس ''تيسير مصطلح الحديث'' اور اس طرح کی بعض کتابیں دیکھ لی جائیں تو علومِ حدیث کا حق ادا ہوجائے گا، ضرورت تو اس کی ویسے بھی کہیں نہیں پڑتی!! بعض طلبہ برکت کے لیے شروعِ سال میں کسی ''ثبت'' (مجموعۂ اسانید) سے ایک سند پڑھ دیتے ہیں کہ اس سے برکت حاصل ہوگئی، اس میں بھی نہ ناموں کے ضبط کی طرف توجہ، نہ تصحیحِ عبارت کی طرف التفات!

بہرکیف ان چاروں میدانوں میں علومِ حدیث کو منطبق کرنے کی ضرورت تھی، لیکن بزبانِ حال اور عملاً گویا یہ فیصلہ کرلیا گیا ہے کہ ہم نے ان علوم کو منطبق نہیں کرنا ہے، برکت کے لیے برائے نام گزر ہوجائے تو مضائقہ نہیں، اہتمام کے ساتھ حق ادا کرنے والے بہت کم ہیں، جن کے لیے پہلے بھی إلا ماشاء الله کہہ کر استثناء کیا گیا ہے، كثّر الله أمثالَهم !

⑤-منکرینِ حدیث اور مستشرقین کی تردید

علومِ حدیث کو منطبق کرنے کا پانچواں میدان' منکرینِ حدیث اور مستشرقین کے اعتراضات کی تردید

ہے، بلکہ صرف علم حدیث نہیں، تاریخ، فقہ، سیرت، اور تمام علومِ دینیہ پر معاندین کی طرف سے پیدا کردہ شکوک وشبہات کے صحیح رد کے لیے ’’علم الإسناد‘‘ میں مہارت ضروری ہے، ’’علم الإسناد‘‘ میں مہارت کے بغیر یہ عمل تقریباً ناممکن ہے۔ مستشرقین کے خلاف انہی اہلِ علم نے کام کیا ہے جن کو ’’علم الإسناد‘‘ میں دلچسپی رہی ہے، کوئی ایسا صاحبِ علم نہیں ملے گا جو علومِ حدیث میں دلچسپی نہ رکھتا ہو اور اس نے مستشرقین کے خلاف کوئی وقیع کام کیا ہو۔

علومِ حدیث کی تطبیق میں مظاہرِ افراط

علومِ حدیث کے استعمال اور تطبیق میں افراط وتفریط کی وجوہ، کثیر اور متنوّع ہیں، پیش نظر مضمون میں ان سب وجوہ کا استقصا مقصود نہیں، بلکہ وجوہِ افراط وتفریط میں سے صرف انتہائی عام اور واضح وجوہ کا ذکر کیا جارہا ہے، ورنہ ان کی فہرست بہت طویل ہے، مثلاً: ’’علمِ عللِ حدیث‘‘ کے استعمال میں افراط وتفریط، ’’علمِ جرح وتعدیل‘‘ کے استعمال میں افراط وتفریط۔ ’’کتبِ مصطلح‘‘ کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ اور متقدمین کی کتابوں کے ساتھ کیا صنیع ہونا چاہیے؟ ایسے بہت سے امور ہیں جن میں علومِ حدیث کی تطبیق کرنے والے افراط وتفریط کا شکار ہوتے ہیں، اس عنوان کے تحت ان سب وجوہ کا ذکر کرنا مقصود نہیں، بلکہ چند اہم وجوہ کا ذکر کیا جارہا ہے:

اِفراط سے مراد ہے: حد سے آگے بڑھ جانا، اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی حدود رکھی ہیں: ’’قد جعل الله لكل شيء قدرا‘‘ (اللہ تعالیٰ نے ہر شے کا ایک انداز مقرر رکھا ہے۔) اگر آپ نے ان حدود کا خیال نہ رکھا تو پھر آپ نے ان علوم کا وہ استعمال نہیں کیا جس کی وجہ سے اس کا استعمال جائز تھا۔

①-متواترات اور مسلّمات میں علومِ حدیث کی تطبیق

اِفراط کے بہت سے مظاہر ہیں، علومِ حدیث (یعنی عرفِ عام میں جن علوم وفنون کو ’’علومِ حدیث‘‘ کہا جاتا ہے، ان) کا اصل میدان ہے: ’’نقد أخبار الأحاد التي حالُ أسانيدِها تحت النظر‘‘ (یعنی ان اخبارِ آحاد کی چھان پھٹک کرنا، جن کی اسانید کا حال قابلِ غور ہے)۔ افراط کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ آدمی یہی اصل مقصد بھول جائے، اور اس اصل میدان کو نظر انداز اور فراموش کر کے نقدِ اخبارِ آحاد کے ان اصولوں کو متواترات، مسلّمات اور عملِ متوارث سے ثابت شدہ امور پر بھی منطبق کرنے کی کوشش کرے، اور یہ مطالبہ کرنے لگے کہ ان امور کی بھی خبرِ واحد کی مانند صحیح سند ہونی چاہیے، یہ افراط کا خطرناک مظہر ہے، اسی نکتے کو علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے یوں بیان کیا ہے:

’’كان الإسناد لئلا يدخل في الدين ما ليس منه، لا ليخرج من الدين ما ثبت

منه بعمل أهل الإسناد. ''(يعني أهل العلم وحملته في العصور الذهبية وفي الأمصار الإسلامية).''

''اسناد کی غرض تو یہ ہے کہ دین کوئی ایسا امر داخل نہ ہو جو دین کا حصہ نہیں، یہ مقصد نہیں کہ خود اہلِ اسناد (سنہرے ادوار اور عہد میں مسلم ممالک کے اہلِ علم اور حاملینِ علمِ دین) کے عمل سے ثابت شدہ امر کو دین سے خارج کر دیا جائے۔''

(شاہ صاحبؒ کے اس ارشاد کی تفصیل کو سمجھنے کے لیے ملاحظہ فرمائیے: فیض الباري، نیل الفرقدین، بسط الیدین، معارف السنن، التعلیقات الحافلة علی الأجوبة الفاضلة للأسئلة العشرة الکاملة، ص:۲۳۸، نیز شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ کی دراسة حدیثیة اور أثر الحدیث الشریف)

یعنی اسناد کا مقصد تو یہ تھا کہ جو چیز' دین کا حصہ نہیں ہے، اس کو دین میں داخل ہونے سے روکا جائے، جب کوئی شخص حدیث بیان کرے تو اس سے مطالبہ کیا جائے: من حدّثك؟ (آپ سے یہ حدیث کس نے بیان کی؟) اگر اس کے پاس ثبوت نہ ہوگا تو: بَقِيَ، یعنی: بَقِيَ حيرانًا، ساكتًا، مُفْحَمًا، مَبْهُوْتًا. (یعنی وہ حیران پریشان، خاموش اور مبہوت رہ جائے گا)۔

اسناد کا مقصد تو یہ تھا، جبکہ جو امورِ دین میں مسلّمہ ہیں، مشہور و مُتَلَقّٰی بالقبول ہیں اور ان پر اہلِ دین اور حاملینِ علمِ دین کا اجماع و توارث ہے، ان کے لیے اس نوع کی سند کی ضرورت نہیں؛ کیونکہ ایسے امور میں اجماع و تلقی ہی سب سے بڑی سند ہے۔ اب اگر کوئی ایسے امور کی سند تلاش کرنے لگے اور جب (اصطلاحی) سند نہ ملے تو اس کا انکار کرنے لگے تو یہ علومِ حدیث کا ان کی حدود سے خارج اور ناجائز استعمال ہوگا۔

ہر دور کے حاملینِ علم کے اعتقادی توارث سے جو عقائد ثابت ہیں، ہر دور کے حاملینِ علم کے فکری توارث سے جو افکار ثابت ہیں، اور ہر دور کے اہلِ علم کے اجماع سے جو مسائل اور احکام ثابت ہیں، ان کے لیے اصطلاحی اسناد کی ضرورت نہیں، اب اگر کوئی علومِ حدیث کے اصول (جن کا مقصد، نقدِ اخبارِ آحاد ہے، ان) کو اِن مسلّمہ امور پر بھی منطبق کرنا شروع کر دے گا تو یہ ان اصولوں کی حدود سے تجاوز ہوگا۔

الغرض علومِ حدیث کے وہ قواعد' جو خبرِ واحد کی جانچ پڑتال کے لیے وضع کیے گئے تھے، ان کو مسلّمات، اجماعیات، متواترات اور متوارثات میں استعمال کرنا بڑا خطرناک معاملہ اور نہایت غلو ہے؛ کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا کرے گا تو عین ممکن ہے کہ ایسے مسلّمات میں کوئی اصطلاحی سند نہ مل سکے؛ کیونکہ اجماع منعقد ہونے کے بعد اُن کے نقلی دلائل (جو اخبارِ آحاد کی شکل میں تھے، ان) کی حفاظت کا اہتمام نہیں کیا گیا؛ اس لیے کہ اجماع خود دلیل ہے، نیز سنتِ متوارثہ، سنتِ خلفائے راشدینؓ، اور توارث و تواترِ مستمر از خیر

القرون بذات خود مستقل دلائل ہیں؛ اس بنا پر ان امور کے متعلق الگ طور پر حدّثنا اور أخبرنا کے ساتھ مروی کوئی روایت اگر موجود بھی تھی تو اس کی حفاظت کا زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا؛ کیونکہ اس سے بڑی دلیل یعنی اجماع موجود ہے، اس لیے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مسئلہ تو اجماعی ہوتا ہے، لیکن اس پر کوئی حدیث نہیں ملتی، یا حدیث مل تو جاتی ہے، لیکن صحیح سند کے ساتھ نہیں ملتی، تو جن لوگوں میں حکمت وفقہ کی کمی ہوتی ہے، اور جو علومِ حدیث کا غلط استعمال کرتے ہیں، وہ اس مسئلہ کا ہی انکار کر دیتے ہیں، اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ اس کی دلیل کے طور پر کوئی صحیح حدیث نہیں ہے! علوم حدیث کو اس طریقے سے استعمال کرنا بہت خطرناک طرزِ عمل ہے۔

اس غلط استعمال اور اس افراط میں جو حضرات پیش پیش ہیں، ان میں طبقہ علماء میں سب سے آگے شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، شیخ کی علمی تقصیرات میں سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ انہوں نے علومِ حدیث کو اپنے دائرے سے باہر غیر محل میں استعمال کیا ہے، چنانچہ کئی مسائل میں ان کے ہاں جمہور امت سے شذوذ آگیا ہے، مثلاً: شیخ البانی کے ہاں آپ کو یہ غلط اور منکر مسئلہ مل جائے گا کہ بلا وضوء مصحف کو چھونا جائز ہے، ایسی بے تکی بات بھی مل جائے گی کہ کوئی شخص نماز چھوڑ دے تو اس کی قضا کی ضرورت نہیں۔ ان مسائل میں یا اس نوع کے دیگر مسائل میں ان سے شذوذ واقع ہونے کی وجہ یا تو علوم حدیث کی غلط تطبیق ہے، یا علمِ اصولِ فقہ کے قواعد کا غلط استعمال ہے۔ اس نوع کے مزید غلط مظاہر کا مشاہدہ کرنے کے لیے ان کی ''کتاب التراویح'' اور ''کتاب الحجاب'' کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ کی ''کتاب الحجاب'' پر ایک نظر

معلوم نہیں کہ شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کتاب' حجاب کو ثابت کرنے کے لیے لکھی ہے، یا اس حکم کو پامال کرنے کے لیے؟! انہوں نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ چہرے کا پردہ ثابت نہیں، حالانکہ اصل پردہ تو ہے ہی چہرے کا، حجاب کا حکم تو سنہ پانچ ہجری میں نازل ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سے پہلے ستر کا حکم تھا یا نہیں؟! یقیناً تھا، تو پھر حجاب کا کیا نیا حکم آیا؟ یا پھر یہ تسلیم کیا جائے کہ حجاب کے حکم سے پہلے خواتین، ستر کو چھپانے کا اہتمام نہیں کرتی تھیں؟!

شیخ البانی کی کتاب کا سرسری مطالعہ کرنے والے تو کہیں گے کہ اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے سب ٹھیک ہے، بہت سی ایسی کتابوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جن میں چہرے کے پردے کو فتنے کی شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، اور کئی ایسی کتابوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جن میں ''إلا ماظہر'' کی تفسیر میں ''الوجه والکفین'' کا ذکر کیا گیا ہے، پھر شیخ البانی نے کیا برا کیا؟!

تفقُّہ اور تأنّی کی کمی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے، علم کے لیے تفقُّہ اور تأنّی کی ضرورت ہے، اگر تفقہ، حلم اور تأنّی

کا استعمال کیا جائے تو سب واضح ہوجاتا ہے۔ تفقُّہ کا استعمال نہیں ہوگا تو یہی نتیجہ ہوگا کہ بہت سے متفق علیہا مسائل کو اختلافی بنادیا جائے گا، مثلاً:

❶- کچھ لوگ کہیں گے کہ معراج کا مسئلہ بھی اختلافی ہے؛ کیوں کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ’’ما فُقِد جسدُ محمد صلی اللہ علیہ وسلم في لیلۃ الإسراء‘‘ (اسراء کی رات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ مبارک (اپنے بستر سے) غائب نہیں ہوا) یہ جملہ کہیں عربی میں لکھا ہوا دیکھا تو بس اتنا کافی سمجھ لیا جائے گا۔ اس جملے کا ماخذ کیا ہے؟ اس کی متصل سند موجود ہے یا نہیں؟ اور اس کی نسبت ثابت ہے یا نہیں؟ ان لوگوں کے نزدیک ان جہتوں کی تحقیق کی ضرورت ہی نہیں ہوگی!

❷- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے کہ وہ معراج کو خواب کہتے تھے۔ جو لوگ تفقُّہ کو کام میں نہیں لائیں گے وہ اس مسئلہ کے بارے میں بھی کہیں گے کہ واقعۂ معراج کے متعلق تو دورِ صحابہؓ میں ہی اختلاف ہوگیا تھا، حالانکہ تحقیقی بات یہ ہے کہ ان حضرات کی طرف ان روایات کی نسبت ہی درست نہیں ہے۔

حلم اور تأنّی نہ ہو تو تحقیق کا عمل انجام نہیں دیا جاسکتا، اور ’’المشي مع الشائعات‘‘ (یعنی عام پھیلی ہوئی باتوں کے پیچھے چلنا) تحقیق کے موانع میں سے بڑا مانع ہے۔ شائعات کو مسلّمات پر قیاس کرنا درست نہیں، شائعات میں تو توقف کرنا چاہیے، انہیں جانچنا پرکھنا چاہیے، اور ان کا ماخذ تلاش کرنا چاہیے۔ اگر کوئی سراغ مل جائے تو اس کے سیاق وسباق کو غور سے دیکھنا چاہیے، اور مظان وغیر مظان میں اس کی تفصیل دیکھنی چاہیے۔

ایک مضمون پر تبصرہ

کچھ عرصہ قبل ایک بنگلہ اخبار میں مضمون چھپا، جس کا عنوان یوں تھا: ’’قرآن کے پردے کو برقع میں کس نے تبدیل کیا؟‘‘ اس میں چہرے کے پردے کا انکار کیا گیا تھا، اور طرح طرح کی خرافات ذکر کی گئی تھیں، اور اس کا مواد شیخ البانی کی مذکورہ کتاب سے لیا گیا تھا (غالباً شیخ البانی کی اس کتاب کا انگریزی یا بنگلہ میں ترجمہ ہوا ہے)، یہ بہت لمبا چوڑا مضمون ہے، کوئی پڑھے گا تو متاثر ہوجائے گا؛ کیونکہ اس میں مختلف کتابوں کے حوالے ہیں، تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابوں کے حوالے ہیں، اور اگر آپ ان حوالوں کی مراجعت کریں گے تو نظر آئے گا کہ وہ حوالے تو ان کتابوں میں موجود ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ’’إلا ما ظهر‘‘ کی تفسیر میں ’’الوجہ والکفین‘‘ کہا ہے، اب آپ اس کے جواب میں کہیں گے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے دوسری تفسیر منقول ہے، تو گویا یہ مسئلہ دورِ صحابہؓ میں مختلف فیہا ہوگیا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ہی حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ چہرے کا پردہ واجب ہے۔ ہمارے مرکز کے ساتھی مولانا زکریا عبداللہ نے اس مضمون پر تبصرہ لکھا ہے، وہ پڑھ کر دیکھیں گے تو حقیقت واضح ہوگی۔ آدمی اگر صبر سے کام لے اور تلاشِ حقیقت کے لیے جستجو جاری رکھے

تو اطمینان حاصل ہوجاتا ہے۔ بے صبری اور تحقیق کا ایک ساتھ جمع ہونا محال ہے، بغیر صبر کے مواد بھی جمع نہیں کیا جاسکتا، جبکہ مواد جمع کرنے کے بعد بھی تحقیق کے کتنے دقیق مراحل ہیں؟!

''الوجه والكفين''، ''زينة'' کی تفسیر ہے یا ''إِلَّا مَا ظَهَرَ'' کی؟

ایک دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو تفسیر منقول ہے کہ انہوں نے ''وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا'' کی تفسیر میں فرمایا: ''الوجه والكفين'' سوال یہ ہے کہ یہ تفسیر ''زينة'' کی ہے یا ''إِلَّا مَا ظَهَرَ'' کی؟ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام میں لکھا ہے کہ: ''یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تفسیر ''زينة'' کی ہو۔'' (۵۳۸/۴) اب اگر آپ یقین سے کہہ رہے ہیں کہ یہ ''إِلَّا مَا ظَهَرَ'' کی تفسیر ہے تو اس کی کیا دلیل ہے؟ یہ ''زِينَتَهُنَّ'' کی تفسیر کیوں نہیں ہوسکتی؟ کون سے قوی قرینہ کی بنا پر آپ اسے ''إِلَّا مَا ظَهَرَ'' کی تفسیر کہہ رہے ہیں؟ کیا کہیں یوں آیا ہے: ''المراد بما ظهر منها: الوجه والكفين''؟! کوئی ایک عبارت دکھادیں! نہیں دکھا سکتے۔ روایت میں یوں ہے کہ انہوں نے آیت ''وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا'' پڑھ کر فرمایا: ''الوجه والكفين''۔ اب اکثر لوگوں نے اس سے یہ سمجھا کہ مراد ''مَا ظَهَرَ مِنْهَا'' کا مصداق بتانا ہے، اس طرف خیال نہ گیا کہ اس سے ''زينة'' کی تفسیر بھی تو مراد ہوسکتی ہے۔ بہرحال یہ بتایا جائے کہ یہ ''زينة'' کی تفسیر کیوں نہیں ہوسکتی؟ اس کی دلیل بتائیں، ورنہ جب ایک جہت کی ترجیح نہیں ہوسکتی تو اس سے استدلال نہ کریں؛ کیونکہ ''إذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال'' (جب احتمال کا دروازہ کھل گیا تو استدلال باطل ہوگیا) اور اگر ترجیح دینی ہے تو اس کی تصریح یا وجہ ترجیح دکھائیں۔

شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ کا تسامح

شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس تفسیر کے لیے جو حوالے دیے ہیں، ان میں ایک حوالہ ''مصنف ابن أبي شيبة'' کا بھی ہے، جب ''مصنّف'' کی مراجعت کی گئی تو وہاں روایت اس طرح ملی: ''وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ، قال: الكف ورقعة الوجه.'' (مصنف ابن ابی شیبہ، ۳۸۴/۳) ''إلى آخره'' بھی نہیں ہے۔ بظاہر حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کو اس مقام میں یہ روایت مستحضر نہیں تھی، ورنہ وہ ضرور اس سے استدلال کرتے۔ مولانا زکریا عبداللہ سلمہ المولی الکریم نے اپنے مقالے میں اس روایت کا ذکر کیا ہے، اور اس کی روشنی میں بات واضح ہے کہ جس ''زینت'' کو ظاہر کرنے سے منع کیا گیا ہے، اس میں چہرہ اور ہتھیلیاں داخل ہیں۔ اب حجاب کے بعد بھی اگر جسم کا کچھ حصہ ظاہر ہوجائے، مثلاً: نقاب ہٹ جائے، یا پیر کی جانب سے کپڑا ہٹ جائے اور زیور ظاہر ہوجائے تو وہ معاف ہے۔ اسی کو فرمایا: ''إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا''

اس کے علاوہ اس بات پر بہت سے قرائن ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ

عورت، چہرہ کھلا رکھے۔ ویسے بھی سوچنے کی بات ہے کہ چہرہ کھلا رہے تو پردہ کس چیز کا نام ہے؟! معمولی عقل بھی استعمال کی جائے تو بات سمجھ آسکتی ہے۔

شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ کو ''مصنف ابن أبي شيبة'' کا حوالہ نہیں دینا چاہیے تھا؛ کیوں کہ اس روایت میں ان کی دلیل نہیں ہے؛ بلکہ یہ روایت ان کے خلاف جاتی ہے، اور جب حوالہ دیا ہے تو وضاحت کرنی چاہیے تھی کہ وہاں روایت کے الفاظ اس انداز سے آئے ہیں۔

خلاصۂ کلام

مذکورہ تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ علومِ حدیث کا ایک غلط استعمال وطریقۂ تطبیق تو یہ ہے کہ اس میں تفقُّہ حاصل کیے بغیر قواعد کا سطحی استعمال کیا جائے، لیکن اس مقام میں یہ نکتہ زیرِ بحث نہیں ہے، بلکہ یہاں عمومی افراط وتفریط زیرِ بحث ہے، یعنی عرفِ عام میں جن علوم کو ''علومِ حدیث'' کہا جاتا ہے، ان کا غیر موضوع لہ میں استعمال؛ کیونکہ ان علوم کا موضوع، اخبارِ آحاد کا نقد ہے، اگر اِجماعیات، مسلّمات اور متوارثات میں ان کا استعمال شروع کیا گیا تو یہ افراط کا خطرناک ترین مظہر ہوگا۔ (جاری ہے)

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

مدارس کو درپیش اصل چیلنج

مولانا محمد سلمان بجنوری
مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، انڈیا

برِصغیر میں مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کے بعد دارالعلوم دیوبند کے قیام سے مدارسِ اسلامیہ کے جس زریں سلسلہ کا آغاز ہوا تھا، وہ اپنے تاریخی سفر کے ڈیڑھ سو سال سے زائد پورے کر چکا ہے، اس عرصہ میں مدارس کے اس نظام نے امتِ اسلامیہ کی جو خدمات انجام دی ہیں، وہ امت کی چودہ سو سالہ تاریخ کا ایک روشن حصہ ہے؛ لیکن آج کے بدلتے حالات میں اس عظیم نظام یا تحریک کو اپنی تاریخ کے سب سے بڑے چیلنج کا سامنا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے مقاصدِ قیام پر مضبوطی سے کاربند رہتے ہوئے کس طرح نئے دور میں اپنی کارگزاری اور اِفادیت کا تسلسل باقی رکھا جائے کہ اپنے اور پرائے، مدارس کے وجود کی اہمیت و معنویت کو تسلیم کریں اور عنداللہ سرخروئی حاصل رہے۔

اس موقع پر درپیش حالات کی وضاحت سے زیادہ ضروری علوم ہوتا ہے کہ مدارس کے مقاصدِ قیام کو ذہنوں میں تازہ کرلیا جائے، تاریخ دارالعلوم میں ’’نصب العین‘‘ کے عنوان کے تحت دارالعلوم کے مقاصدِ قیام جو قدیم دستورِ اَساسی سے نقل کیے گئے ہیں، یہاں پیش کیے جاتے ہیں، کیوں کہ یہی تمام مدارس کے قیام کے حقیقی اور بنیادی مقاصد ہیں۔ تاریخ دارالعلوم جلد اوّل، ص: ۱۴۲ پر لکھا ہے:

’’دارالعلوم دیوبند کا قیام جن مقاصد کے لیے عمل میں لایا گیا، ان کی تفصیل دارالعلوم کے قدیم دستورِ اَساسی میں حسبِ ذیل بیان کی گئی ہے:

❶- قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد و کلام اور ان علوم کے متعلقہ ضروری اور مفید فنونِ آلیہ کی تعلیم دینا اور مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات بہم پہنچانا، رشد و ہدایت اور تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی خدمت انجام دینا۔

❷- اعمال و اخلاقِ اسلامیہ کی تربیت اور طلبہ کی زندگی میں اسلامی روح پیدا کرنا۔

❸- اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور دین کا تحفظ و دفاع اور اشاعتِ اسلام کی خدمت بذریعہ تحریر

وتقریر بجالانا اور مسلمانوں میں تعلیم وتبلیغ کے ذریعہ سے خیر القرون اور سلف صالحین جیسے اخلاق واعمال اور جذبات پیدا کرنا۔

❹- حکومت کے اثرات سے اجتناب واحتراز اور علم وفکر کی آزادی کو برقرار رکھنا۔

❺- علومِ دینیہ کی اشاعت کے لیے مختلف مقامات پر مدارسِ عربیہ قائم کرنا اور اُن کا دار العلوم سے الحاق۔

یہ وہ زریں مقاصد ہیں جو بنیادی طور پر بانیانِ مدارس کے پیش نظر رہے اور جن کو پیش نظر رکھ کر ان مدارس نے اپنا یہ ڈیڑھ صدی کا سفر؛ عزت ووقار اور نافعیت وافادیت کے ساتھ پورا کیا۔

آج کے بدلتے حالات اور ماحول میں جب کہ مدارس کو اندرونی وبیرونی بے شمار خطرات کا سامنا ہے، سب سے بڑا چیلنج یہی ہے کہ ان بیش بہا مقاصد اور اس بنیادی نصب العین پر مضبوطی سے کاربند رہتے ہوئے کس طرح اپنا سفر جاری رکھا جائے۔ اس کے لیے نہایت سنجیدہ غور وفکر، باہمی مشاورت، آپسی رابطہ و تعاون اور دور اندیشانہ وبصیرت مندانہ فیصلوں کی ضرورت ہوگی اور ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بلند ہوکر، کامل اخلاص کے ساتھ کام کرنا ہوگا جس کے نتیجہ میں نصرت الٰہی کے ساتھ مدارس پر امت کے اعتماد اور وابستگی میں بھی اضافہ ہو اور یہ نظام، اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے درپیش خطرات کا مقابلہ کرسکے اور ذمہ دارانِ مدارس اپنے اکابر کے سامنے سرخروئی کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ:

رندانِ قناعت پیشہ نے رکھی تھی بنائے مے خانہ
جھکتا ہے انھی کے قدموں پر چلتا ہے جو کوئی پیمانہ

(بشکریہ ماہنامہ دار العلوم دیوبند)

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

دینی مدارس کے بارے میں آئی ایس پی آر کی پریس کانفرنس پر

اہلِ مدارس کا متفقہ اعلامیہ

ادارہ

(مؤرخہ: ۳۰ر جولائی ۲۰۲۴ء، بروز منگل، جامعہ دار العلوم کراچی)

یہ اجلاس ڈائریکٹر جنرل آئی ایس پی آر لیفٹننٹ جنرل ارشد شریف چوہدری کی ۲۲ر جولائی ۲۰۲۴ء کی پریس کانفرنس کے تناظر میں منعقد ہوا، اجلاس میں اتفاقِ رائے سے مندرجہ ذیل بیان کی منظوری دی گئی:

1- دینی مدارس وجامعات کے قائدین کا اجلاس ڈی جی آئی ایس پی آر کے بیان اور اندازِ بیان کی شدید مذمت اور رَد کرتا ہے، اس میں یہ تأثر دیا گیا ہے کہ ۵۰ فیصد دینی مدارس وجامعات اور ان کے سربراہان نامعلوم لوگ ہیں۔ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دینی مدارس وجامعات اور ان کے چلانے والوں کو پوری قوم جانتی ہے اور الحمد لله علی إحسانه ان کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ یہ مدارس پاکستان کے قانون کے تحت قائم ہوئے ہیں اور قانون کے دائرے میں مصروفِ عمل ہیں، اس طرح کا لب ولہجہ کسی بھی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس سے ملک بھر میں قائم دینی مدارس وجامعات کے سربراہان، اساتذہ کرام، طلبہ و طالبات، معاونین اور کروڑوں دین دار طبقات کے جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ ہم چیف آف آرمی اسٹاف جناب جنرل سید عاصم منیر سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے ادارے کے ذمہ دار افسران کو ہدایات جاری کریں کہ وہ دینی مدارس وجامعات کے سربراہان، اساتذہ اور طلبہ وطالبات کو مجرم یا ملزم یا مشتبہ سمجھ کر بات نہ کریں، عوام میں آکر دیکھیں کہ ان لوگوں کی عزت کیا ہے؟

2- دینی مدارس وجامعات کے سربراہان نے ملکی تحفظ، سلامتی اور مفاد کو ہمیشہ مقدم رکھا ہے اور کبھی بھی ملکی استحکام اور سلامتی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا، ہر مشکل مرحلہ پر مسلح افواج کی حمایت کی اور ہمیشہ دہشت گردی اور فساد کی مخالفت کی اور اس کے نتائج بھی بھگتے، اکابر علماء ومشائخ اس مشن میں شہید ہوئے۔

3- جب پیغامِ پاکستان مرتب کیا گیا تو انہی علماء نے خودکش حملوں اور دہشت گردی کے خلاف کسی صلہ وستائش کی خواہش کے بغیر محض ملک وملت کی خاطر فتوے جاری کیے، تب یہ اہلِ مدارس ذمہ دار بھی تھے، محبِ وطن بھی تھے اور انہی اداروں کے ذمہ داران اُن کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے۔

4- دینی مدارس وجامعات پاکستان میں خواندگی کو فروغ دیتے ہیں، پسماندہ علاقوں سے بچوں کو لاکر محبِ وطن بناتے ہیں، علم سے آراستہ کرتے ہیں اور معاشرے کا صحت مند شہری بناتے ہیں، ورنہ یہی نوجوان ملک کے مقابل آمادۂ پیکار گروہوں کے ہاتھ چڑھتے اور ملک کے خلاف استعمال ہوتے، آج ان اداروں کی خدمات کی قدر کرنے کے بجائے انہیں شک کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے۔

5- دینی مدارس وجامعات کے ذمہ داران نے سیاسی انتشار اور محاذ آرائی سے فائدہ اٹھانے کا کبھی سوچا بھی نہیں ہے، ہمیشہ ملک کی خیرخواہی کی ہے، مسلح افواج اور ملکی سلامتی کے لیے دعا گو رہے ہیں۔

6- اتحادِ تنظیماتِ مدارس پاکستان کی قیادت نے ہمیشہ مزاحمت کے بجائے مذاکرات اور مکالمے کو ترجیح دی ہے، ہماری تاریخ اس کی شاہد عدل ہے، لیکن ذمہ دار قوتوں نے طے شدہ معاملات کو ہمیشہ قانونی شکل دینے کے بجائے اس میں رکاوٹیں ڈالی ہیں، وقت آ گیا ہے کہ اس روش کو ترک کرکے سنجیدگی سے مسائل کو حل کیا جائے اور ماتحت افسران کے بجائے وہ سربراہان جن کے پاس فیصلہ کرنے، اسے قانونی شکل دینے اور نافذ کرنے کا اختیار ہے، وہ دینی مدارس کے بارے میں سرسری اور غیر ذمہ دارانہ بیانات جاری کرنے والوں کو روکیں، اور مدارس کے مسئلہ پر سنجیدگی کا مظاہرہ کریں۔

7- مفاہمت کی حکمت عملی اختیار کرنے کے بجائے دینی مدارس وجامعات کو مزاحمت کے راستے پر ڈالنے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش کی جارہی ہے۔ ہم متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ موجودہ طرزِ عمل سے ان عناصر کو تقویت نہ پہنچائی جائے جو مفاہمت کے بجائے مدارس کو مزاحمت پر مجبور کریں۔ ملک وملت کا فائدہ اسی میں ہے کہ معقولیت اور شائستگی کا راستہ اختیار کیا جائے۔

8- بااختیار اداروں کی یہ حکمت عملی ہماری سمجھ سے بالا ہے کہ ایک طرف مالی معاملات میں شفافیت کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور دوسری طرف دینی مدارس وجامعات کے بینک اکاؤنٹس کو منجمد کردیا جاتا ہے اور شیڈولڈ بینکوں میں اکاؤنٹ کھولنے اور انہیں آپریٹ کرنے کو ناممکن بنایا جارہا ہے، یہ عملی تضاد ناقابلِ فہم ہے۔

9- ہمارے تجربات نے بتایا ہے کہ اس وقت حقیقی اقتدار واختیار ریاست کے پاس ہے، اس لیے بہتر ہوگا کہ چیف آف آرمی اسٹاف خود براہِ راست اس مسئلے کا سنجیدگی سے جائزہ لیں، اور اس کے دوررس نتائج کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مدارس کے ساتھ ریاستی اداروں کا رویہ درست کریں اور اس معاملے میں کسی بیرونی دباؤ کی

پروانہ کریں۔

10-اتحادِ تنظیماتِ مدارس پاکستان کی قیادت نے فیصلہ کیا ہے کہ دینی مدارس وجامعات کی حریتِ فکر وعمل پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا جائے گا، ہر قیمت پر دینی مدارس وجامعات کی حریتِ فکر وعمل کا تحفظ کیا جائے گا، اس مقصد کے لیے چاروں صوبائی صدر مقامات اور وفاقی دارالحکومت میں دینی مدارس وجامعات کے بڑے بڑے کنونشن منعقد کیے جائیں گے اوران میں اہلِ مدارس اور پوری قوم کو حقائق سے آگاہ کیا جائے گا۔

11-پاکستان کے دینی مدارس وجامعات میں دیگر ممالک سے طلبہ وطالبات دینی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے اور وہ واپس جاکر اپنے اپنے ممالک میں پاکستان کے غیر سرکاری سفیر کا کردار ادا کرتے تھے، نامعلوم وجوہات کی بنا پر غیر ملکی طلبہ کو ویزے دینے بند کردیے گئے اور اس طرح رضا کارانہ سفارت کاری کا باب بند کردیا گیا اور اب وہ لوگ بھارت کا رخ کرتے ہیں اور اس کا فائدہ بھارت کو پہنچ رہا ہے، جبکہ ساری دنیا میں تعلیم وتعلّم کے لیے روابط کھلے رہتے ہیں، خود ہمارے ملک کے طلبہ مختلف شعبوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے دنیا بھر کے ممالک جاتے ہیں اور ایسے عالم میں کہ ہم ایک ایک ڈالر کے محتاج ہیں، زرِمبادلہ باہر جارہا ہے، جبکہ دینی مدارس وجامعات میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات اپنے اپنے ممالک سے زرِمبادلہ پاکستان لارہے تھے۔ خود ہماری یونیورسٹیوں میں بھی بیرون ممالک کے طلبہ زیرِتعلیم ہیں۔

12-ہم ایک بار پھر حقیقی بااختیار اربابِ اقتدار کو پیغام دینا چاہتے ہیں: ملک وملت کا مفاد اس میں ہے کہ دینی مدارس وجامعات کو حریف سمجھنے کے بجائے حلیف سمجھا جائے۔ پراپیگنڈے اور بدگمانیوں پر قائم کردہ تاثر کو ذہنوں سے نکالا جائے اور حسنِ ظن اور اخلاص کے ساتھ مسائل کو سلجھایا جائے۔

13-اتحادِ تنظیماتِ مدارس پاکستان کا پہلا صوبائی کنونشن ۲۸/اگست ۲۰۲۴ء بروز بدھ صبح ۹/بجے کراچی میں منعقد ہوگا۔

14-اتحادِ تنظیماتِ مدارس پاکستان کی رکن تنظیمیں حسب ذیل ہیں:

(الف) وفاق المدارس العربیہ پاکستان

(ب) تنظیم المدارس اہل سنت پاکستان

(ج) وفاق المدارس الشیعہ پاکستان

(د) وفاق المدارس السّلفیہ پاکستان

(ہ) رابطۃ المدارس الاسلامیہ پاکستان

سرزمینِ فلسطین (اہمیت وفضیلت) قرآن وحدیث کی روشنی میں (دوسری اور آخری قسط)

مولانا محمد ارشد خان
فاضل دار العلوم دیو بند (وقف)، انڈیا

⑤: سفرِ معراج میں بیت المقدس میں حاضری

سفرِ معراج میں حضور اکرم ﷺ کو اولاً بیت المقدس لے جایا گیا جہاں آپ ﷺ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کی امامت فرمائی، پھر آسمان کی طرف آپ ﷺ تشریف لے گئے۔ (شرح مشكل الآثار: ١٢/ ٥٣٨)

⑥: حضور ﷺ کا مکہ مکرمہ سے بیت المقدس کا نظارہ فرمانا

حضور اکرم ﷺ جب سفرِ معراج سے واپس تشریف لائے اور آپ کے سفر کی بابت کفارِ مکہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے بیت المقدس سے متعلق حالات، دروازے اور کھڑکیوں کی تعداد سے متعلق سوالات کیے تو بطور معجزہ یکدم سارے حجابات درمیان سے مرتفع ہوگئے اور بیت المقدس کو حضور اکرم ﷺ کے سامنے کردیا گیا، پھر آپ ﷺ نے اُسے دیکھ کر سارے جوابات ارشاد فرمائے۔ (مستفاد: صحيح البخاري، ت: تقي الدين ندوي: ٣٨٨/ ٣، رقم الحديث: ٣٨٨٦)

⑦ - ہرقل کا بیت المقدس سے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو خط لکھنا

سن ٦ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد حضور ﷺ نے جب شاہانِ عالم کی طرف دعوتِ اسلام کے خطوط روانہ کرنا شروع کیے تو ان میں ایک خط آپ نے قیصر روم کو بھی ارسال فرمایا، قیصر روم اس وقت ایلیا یعنی بیت المقدس میں تھا، اس نے عرب کے کسی باشندے کو طلب کیا، اتفاق سے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سفرِ تجارت پر شام گئے ہوئے تھے اور اس وقت آپ غزہ میں مقیم تھے، تو اس کے حواریوں نے آپؓ کو اس کے روبرو پیش کیا، پھر اس نے آپ ﷺ کے بارے میں حضرت ابوسفیانؓ سے مکالمہ کیا، جس کے بعد حضرت ابوسفیانؓ وغیرہ پر حضور اکرم ﷺ کی ہیبت واہمیت طاری ہوگئی۔ (مستفاد از سیرتِ مصطفی: ٢/٣٦٦)

⑧: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیت المقدس کے قریب دفن ہونے کی خواہش

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ وادیِ تیہ میں تھے، اچانک ایک دن آپ کے پاس ملک الموت تشریف لائے، حضرت نے انہیں ایک چپت رسید کی، جس سے ان کی آنکھ پھوٹ گئی، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی بینائی دوبارہ لوٹائی اور انہیں دوبارہ حضرت کے پاس بھیجا، انہوں نے آکر اللہ تعالیٰ کا حکم آپ کو سنایا کہ اگر آپ رہنا چاہتے ہیں تو فلاں بیل کی پشت پر ہاتھ پھیریں تو اس کے بال کے بقدر آپ کی عمر میں اضافہ کردیا جائے گا، اس موقع پر حضرت نے اللہ تعالیٰ سے بیت المقدس (فلسطین) کے قریب دفن کی خواہش ظاہر فرمائی۔
(مستفاد: صحيح البخاري، ت: تقي الدين ندوي: ٦٣٩/ ١، رقم الحديث: ١٣٣٩)

فائدہ: ملک الموت انسانی روپ میں آئے تھے، اور بلا اجازت واطلاع آئے تھے تو آپ علیہ السلام نے سرزنش کے طور پہ ضرب لگائی۔ (مستفاد از انعام الباری: ۵۰۷/ ۴، نجاح القاری: ۸/۳۶۴)

⑨: ارضِ مقدسہ میں فتنوں کے حوالے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارضِ مقدسہ میں خلافت کے قائم ہونے پر فتنوں کی پیش گوئی فرمائی ہے، نیز اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی علامت بھی قرار دیا ہے، اکثر شارحین کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد سرزمینِ شام ہے اور خلافت سے مراد خلافتِ بنواُمیہ ہے۔ (أبو داود مع بذل المجهود: ١٠٣/ ٩، رقم الحديث: ٢٥٣٥)

⑩ - بیت المقدس انبیاء علیہم السلام کا منبرِ دعوت رہا ہے

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ایک مرتبہ پانچ باتوں کا حکم فرمایا، معاً بنی اسرائیل کو ان باتوں کی طرف دعوت کا بھی حکم دیا تو آپ علیہ السلام بیت المقدس تشریف لے گئے اور بنی اسرائیل کو اس میں جمع فرماکر ارشادِ ربانی سے انہیں آشنا کیا۔ (مستفاد: سنن الترمذي قديم، كتاب الأمثال: ٥٧٦/ ٢)

⑪ - دجال سے بیت المقدس کا تحفظ

دجال کے خروج کے بعد اس کی شرانگیزی اور دسترس سے کوئی چیز بچ نہ سکے گی، بے شمار استدراجات اس کے ہاتھ پر ظاہر ہوں گے، اس کے ایک ہاتھ میں جنت اور دوسرے میں دوزخ ہوگی، اہلِ ایمان شدید ابتلاء وآزمائش سے دوچار ہوں گے، دجال کی ریشہ دوانی کسی ایک خطہ تک محدود نہ ہوگی کہ لوگ کسی محفوظ خطہ کی طرف منتقل ہوجائیں، بلکہ چند دنوں میں پورے عالم کا وہ چکر لگالے گا، البتہ بنصِ حدیث مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، مسجدِ اقصیٰ اور طور اس کے قدم پر فتن سے محفوظ ہوں گے۔ (مسند الإمام أحمد: ١٨٠/ ٣٨)

⑫ - شام میں فساد کا وقوع خیر سے محرومی کا باعث ہوگا

جب اہلِ شام میں بگاڑ آجائے گا تو خیر وہاں سے اُٹھالی جائے گی، عند البعض اس سے مراد بنوامیہ کا

دور ہے، اسی طرح جب جب وہاں بگاڑ ہوگا تو خیر سلب کر لی جائے گی، تاہم قیامت تک ایک جماعت حق پر قائم رہے گی اور بلاخوف لومۃ لائم اپنی ذمہ داری ادا کرتی رہے گی۔ (مستفاد من تحفة الألمعي: ٥/ ٥٧١)

⑬: شام میں خصوصی رحمتِ حق

اہلِ شام کے لیے حضور اکرم ﷺ کی خصوصی دعائیں اور بشارتیں رہی ہیں، انہیں میں سے ایک مژدہ جانفزا یہ بھی ہے کہ ملائکہ خداوندِ قدوس اہلِ شام پر اپنا پر پھیلائے ہوئے ہیں، مراد اس سے کفر، مہلکات و موذیات سے تحفظ اور خصوصی برکات ہے۔ حافظ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ: طوبیٰ سے مراد یہ دعا ہے کہ: ''اللّٰھم طيبها بكثرة المؤمنين و الخواص من أمتي لكثرة الأنبياء بها.'' (سنن الترمذي: ٢/ ٧١٤)

⑭: -فتنوں کے دور میں شام کو اپنا مسکن بناؤ

ملک شام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ حضر موت جو کہ عدن کے قریب واقع ہے جب اس میں آگ بھڑک اُٹھے گی یا عند البعض جب وہاں سے فتنے رونما ہوں گے تو اہلِ ایمان کو اپنا تحفظ اور متاعِ ایمان کی حفاظت کے لیے شام کا رخ اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ ملک شام اس وقت اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت گاہ بنا ہوا ہوگا۔ (سنن الترمذي: ٤٩٢/ ٢)

⑮ -فتنوں کے زمانے میں شام دار الہجرت ہوگا

قربِ قیامت میں جب شورش و فتنے ہر جانب سے رونما ہوں گے، ناگفتہ بہ حالات ہوں گے، پُرفتن حوادث وقوع پذیر ہوں گے تو اس پر آشوب دور میں اہلِ ایمان اپنے متاعِ دین واسلام کے تحفظ کے لیے ہجرت پر آمادہ ہوں گے، نیز انہیں ہجرت کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دار الہجرت یعنی شام کا ہی رُخ کرنا ہوگا، تاکہ حفظ وامان میسر آئے۔ (أبو داؤد مع البذل: ٩/ ١٧، رقم الحديث: ٢٤٨٢)

⑯: -فتنوں کے زمانے میں شام میں دینی حصار ہوگا

حضور اکرم ﷺ کو بذریعہ خواب دکھلایا گیا کہ فتنوں کے زمانے میں دین وایمان کا تحفظ شام میں ہوگا، لہٰذا آپ ﷺ نے قربِ قیامت میں فتنوں کے وقوع پذیر ہونے کے بعد شام کی طرف ہجرت کا حکم صادر فرمایا۔ (مستفاد: فتح القريب المجيب شرح الترغيب و الترهيب: ١٢/ ٣٨٢)

⑰: -شام کے لیے برکت کی دعا

حضور اکرم ﷺ نے شام کے لیے برکت کی دعائیں مانگی ہیں:

''عن ابن عمرؓ قال: ذكر النبي ﷺ: اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ شَامِنَا اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ يَمَنِنَا.'' (صحيح البخاري، ت: تقي الدين: ٦/٢٠٩، رقم الحديث: ٧٠٩٤)

شیخ اسماعیل ہنیہ شہید رحمۃ اللہ علیہ

محمد اعجاز مصطفیٰ

شیخ اسماعیل ہنیہ شہیدؒ فلسطینی اتھارٹی کے سابق وزیر اعظم، بورڈ آف ٹرسٹیز کے سیکریٹری، فلسطینی مزاحمتی تنظیم کے سیاسی ونگ کے سربراہ اور اسلامی مزاحمتی رہنماؤں میں سے ایک تھے، جو فلسطین کو صہیونی قبضے سے آزاد کرانے کی تگ و دو میں رہتے تھے، نیز شیخ احمد یاسین شہیدؒ کے دفتر کے سربراہ بھی رہ چکے ہیں۔ انہیں ۳۱/ جولائی ۲۰۲۴ء کو ایران کے دارالخلافہ تہران میں اس وقت شہید کیا گیا جب وہ ایران کے صدر مسعود زشکیان کی حلف برداری کی تقریب میں شرکت کے لیے ایران آئے ہوئے تھے، کہا جاتا ہے کہ اسرائیل کی جانب سے ان کی اقامت گاہ کو نشانہ بنایا گیا، جس میں وہ اپنے ایک محافظ سمیت شہید ہوگئے۔ انہیں بجا طور پر ''فلسطینی مزاحمت کی علامت'' اور ''شہیدِ قدس'' کا لقب دیا گیا ہے۔

شیخ ہنیہؒ کا تعلق غزہ شہر کے ساحل پر واقع پناہ گزین کیمپ سے تھا، جہاں وہ ایک پناہ گزین خاندان میں ۱۹۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عرب اسرائیل جنگ کے بعد اسرائیل نے غزہ کا محاصرہ کرلیا تھا۔ اسماعیل ہنیہؒ نے فلسطینی پناہ گزینوں کے لیے اقوام متحدہ کے ادارے اونروا کے زیر انتظام اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں اسماعیل ہنیہؒ نے غزہ شہر کی اسلامی یونیورسٹی میں عربی ادب کی تعلیم حاصل کی اور دورانِ طالب علمی اسلامی طلبہ تنظیم میں شامل ہوئے جو بعد میں حماس کی صورت میں سامنے آئی۔ ۱۹۸۷ء میں اسرائیلی قبضے کے خلاف پہلی انتفاضہ (انقلاب) کے دوران ہنیہؒ فلسطینی نوجوانوں کے احتجاج میں شامل رہے اور اسی دوران حماس کی بنیاد رکھی گئی۔ آپ نے ایک انٹرویو میں اپنے بارے میں یوں روشنی ڈالی ہے:

> ''میرے والد صوفیا میں سے تھے، وہ شیخ طریقت تھے، ان کے پاس مشائخ آتے تھے اور وہ ذکر کی مجالس قائم کرتے تھے۔ میں اسی ماحول میں پلا بڑھا، ہمارے گھر کے قریب ہی خانقاہ ہوا کرتی

تھی، وہاں میرے والد صاحب مجالس قائم کرتے تھے، میں ان مجالسِ ذکر کو دیکھا کرتا تھا، تعزیتی مجلسیں ہوتی تھیں، ان میں تین دن تک قرآن کریم پڑھا جاتا تھا، میں بھی بعض مجالس میں قرآن کریم پڑھتا تھا، تعزیتی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا، خاص طور پر اس وقت جب میں کچھ بڑا ہوگیا تھا، ستر کی دہائی کے آغاز میں۔ نیز میرے والد محترم مسجد کے مؤذن تھے، مسجد ہمارے گھر سے قریب تھی، وہ نمازِ فجر کی اذان کا اہتمام کرتے تھے، میری عمر تقریباً چھ سال تھی، وہ روزانہ مجھے جگاتے تھے، میں ان کے لیے چراغ لے کر جاتا تھا، کیونکہ اس وقت مسجد اور راستوں میں بجلی نہیں ہوتی تھی، میں جا کر مسجد کے دروازے کھولتا، وہ اذان دیتے پھر میں ان کے ساتھ نماز ادا کرتا۔ میرے بننے میں، میرے افکار تشکیل پانے میں، میرے نفس کو دین اور شعائرِ اسلام کے قریب کرنے میں، حتّٰی کہ صوفیت کے قریب کرنے میں یہ پہلی تربیت تھی جو مجھ پر بہت زیادہ اثر انداز ہوئی۔‘‘

اسماعیل ہنیہ شہیدؒ کئی دفعہ اسرائیل کے توسط سے گرفتار ہوئے اور ۱۹۸۹ء میں تین سال تک انہیں قید خانے میں رکھا گیا۔ ۱۹۹۲ء میں انہیں حماس اور تحریکِ جہادِ اسلامی فلسطین کے کئی سرگرم کارکنوں کے ساتھ ایک سال کے لیے لبنان کے جنوب میں مَرْج الزُّھور نامی جگہ پر جلاوطن کیا گیا۔ اسماعیل ہنیہ شہیدؒ نے ۶ مئی ۲۰۱۷ء کو خالد مشعل کے بعد حماس کی سیاسی قیادت سنبھالی۔ اس سے پہلے وہ ۲۰۰۶ء میں فلسطین کے عام انتخابات میں کامیاب ہو کر فلسطینی اتھارٹی کے وزیر اعظم منتخب ہوئے، تاہم جون ۲۰۰۷ء میں فلسطینی اتھارٹی کے صدر محمود عباس نے انہیں اس عہدے سے ہٹا دیا۔ ہنیہؒ کو امریکا نے ۲۰۱۸ء میں دہشت گردوں کی فہرست میں شامل کیا۔ اپنی عمر کے آخری سالوں میں وہ قطر میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اسماعیل ہنیہ شہیدؒ اپنی جدوجہد اور سیاسی سرگرمیوں کے دوران مزاحمتی بلاک کے راہنماؤں کے ساتھ تعاون اور رابطے میں رہے۔

اسماعیل ہنیہ شہیدؒ کے چند جملے

’’ہم تسلیم نہیں کریں گے، ہم تسلیم نہیں کریں گے، ہم اسرائیل کو تسلیم نہیں کریں گے۔‘‘

’’خدائے واحد کے حکم سے قلعے نہ گریں گے، نہ قلعے ٹوٹیں گے اور نہ عہدوں کو ہم سے چھین لیا جائے گا۔‘‘

’’ہم وہ لوگ ہیں جو موت کو اسی طرح پسند کرتے ہیں جیسے ہمارے دشمن زندگی سے پیار کرتے ہیں۔‘‘

اسماعیل ہنیہؒ کا قتل حماس کے لیے ایک بڑا نقصان ہے، لیکن اسرائیل کی جانب سے ماضی میں بھی حماس کے رہنماؤں کو قتل کیا جاتا رہا ہے، جس نے فلسطینی مزاحمت کو کمزور کرنے کے بجائے مزید مضبوط کیا ہے۔

اسماعیل ہنیہؒ کی زندگی فلسطینیوں کے حقوق اور آزادی کی جدوجہد کے لیے وقف تھی اور ان کا نام فلسطینی تحریک کے اہم رہنماؤں میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ۶ رمئی ۲۰۱۷ء کو اسماعیل ہنیہؒ کو حماس کی شوریٰ نے سیاسی شعبے کا سربراہ منتخب کیا۔

اسماعیل ہنیہؒ نے سولہ سال کی عمر میں اپنی کزن امل ہانیہ سے شادی کی، اور ان کے ۱۳ بچے تھے، جن میں آٹھ بیٹے اور پانچ بیٹیاں شامل ہیں۔ ان کے آٹھ بیٹوں میں سے تین بیٹے اور چار پوتے، پوتیاں ۱۰ راپریل ۲۰۲۴ء کو غزہ کی پٹی پر عید کے دن ہونے والے ایک اسرائیلی فضائی حملے میں شہید ہوئے تھے۔ حماس سے منسلک میڈیا کے مطابق اسماعیل ہنیہؒ کے بیٹے ایک گاڑی میں سفر کر رہے تھے، جب غزہ کی پٹی میں ایک کیمپ کے قریب انھیں نشانہ بنایا گیا۔ اسماعیل ہنیہؒ نے ایک بیان میں کہا تھا کہ: اس واقعے سے حماس کے مطالبات میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

ان کی شہادت پر دنیا کے مختلف سیاسی اور مذہبی راہنماؤں اور تنظیموں کا ردِّعمل سامنے آیا اور مختلف اسلامی ممالک میں ان کے قتل کے خلاف مظاہرے کیے گئے۔ ان کی پہلی نمازِ جنازہ تہران میں ادا کی گئی، جس میں کثیر تعداد نے شرکت کی۔ دوسرے روز ان کا جسدِ خاکی قطر لے جایا گیا، جہاں مسجد محمد بن عبدالوہاب میں ان کی دوسری نمازِ جنازہ کے بعد انہیں سپردِ خاک کیا گیا۔

جامعہ کے رئیس حضرت مولانا سیّد سلیمان یوسف بنوری، نائب رئیس حضرت مولانا سیّد احمد یوسف بنوری، ادارہ بینات، جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ، محترم جناب اسماعیل ہنیہؒ کی شہادت کو جہادِ فلسطین کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ سمجھتے ہیں، اُن کے ورثاء اور لواحقین سے تعزیت کرتے ہیں، اور دعا گو ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی شہادت کی برکت سے ارضِ فلسطین کو آزادی نصیب فرمائے، قبلۂ اوّل کو صہیونیوں کے قبضے سے آزاد فرمائے، اور مجاہدینِ فلسطین کو کامیاب و کامران فرمائے، آمین بجاہ سیّد المرسلین!

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

صفر المظفر سے متعلق اہم مسائل

ادارہ

صفر کے آخری بدھ میں بیماری سے بچاؤ کے لیے خاص عمل کرنے کا حکم

سوال

میرے دادا جان صفر کے مہینے کے آخری بدھ چند مرتبہ یاسین شریف اور درود شریف پڑھ کر رات بھر عبادت کر کے صبح بواسیر کے مریضوں کو پانی دیا کرتے تھے۔ اب ان کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داری مجھ پر آگئی ہے تو میں جاننا چاہتا ہوں کیا ان کا یہ عمل صحیح تھا یا نہیں؟ اور مجھے یہ عمل کرنا چاہیے یا نہیں؟ اور جو لوگ پانی لے جاتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ ہم کو الحمد للہ اللہ تعالیٰ اس پانی کے ذریعے سے شفا دیتا ہے۔

برائے کرم مفتی صاحب اب بدھ کو چند ہی دن باقی ہیں تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ تاکہ میں گھر والوں کے سامنے اُسے بیان کرسکوں!

جواب

واضح رہے کہ ماہِ صفر کے آخری بدھ کے حوالے سے عوام الناس میں یہ مشہور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس روز مرض سے صحت پائی تھی، لوگ اس خوشی میں کھانا، شیرینی وغیرہ بھی تقسیم کرتے ہیں، اس حوالے سے جامعہ کے سابقہ فتاویٰ میں ہے:

’’ماہِ صفر کے آخری بدھ کے بارے میں لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس روز آپ ﷺ مرض سے صحت یاب ہوگئے تھے، اس لیے عید کی طرح خوشیاں مناتے ہیں، خصوصًا مزدور طبقہ مالکان سے چھٹی مانگتا ہے، مٹھائی کے پیسے اور عیدی طلب کرتا ہے، یہ محض بے اصل اور بدعت ہے، کھانے پینے کی غرض سے لوگوں نے اس کو ایجاد کیا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ صفر کے آخری بدھ کو رسول اللہ ﷺ کے مرضِ وفات کی ابتدا ہوئی تھی۔ دیکھیے:

تاریخ ابن اثیر، تاریخ طبری، البدایہ والنہایہ۔ لہٰذا جن لوگوں میں یہ رواج جاری ہے، ان کو چاہیے کہ اس بدعت کو چھوڑ دیں، شریعتِ اسلامیہ کے اَحکام کی پیروی کریں۔

شریعتِ اسلامیہ کے نزدیک ماہِ صفر بھی دوسرے مہینوں کی طرح ایک مہینہ ہے، ایامِ جاہلیت میں اس ماہ صفر کے بارے میں جو تصور تھا کہ یہ نحوست کا مہینہ ہے، اسلام نے اس کو رد کیا ہے، جیسا کہ بخاری و مسلم اور دوسری کتب میں واضح الفاظ میں: ''لا صفر و لا طیرۃ'' وغیرہ سے ایامِ جاہلیت کے عقائدِ فاسدہ کی سختی کے ساتھ تردید کی گئی ہے؛ اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ اس بدعتِ قبیحہ کو ترک کر دیں، اور ایسے عقائدِ فاسدہ سے توبہ کریں۔

فقط واللہ اعلم

کتبہ: محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ (صفر ۱۴۰۸ھ) — الجواب صحیح: ولی حسن ٹونکی''

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

> ''ماہِ صفر کے آخری چار شنبہ کو خوشی کی تقریب منانا، مٹھائی وغیرہ تقسیم کرنا شرعاً بے دلیل ہے، اس تاریخ میں غسلِ صحت ثابت نہیں، البتہ شدتِ مرض کی روایت ''مدارج النبوۃ'' میں ہے۔ یہود کو آں حضرت ﷺ کے شدتِ مرض سے خوشی ہونا بالکل ظاہر ہے، اور ان کی عداوت و شقاوت کا تقاضا ہے۔'' (فتاویٰ محمودیہ، کتاب العقائد، باب البدعات و الرسوم، مخصوص ایام کی مروج بدعات کا بیان، (۳/۲۷۹، ۲۸۰)، ط: جامعہ فاروقیہ، کراچی)

لہٰذا اگر ماہِ صفر کے آخری بدھ اس نظریے کے تحت شفایابی کے لیے کوئی عمل کیا جاتا ہے تو یہ بے اَصل ہونے کے ساتھ قابلِ ترک ہے، اگر یہ عمل کرنے والے کا یہ نظریہ نہیں ہے، لیکن لوگوں کے ذہن میں یہ پہلو غالب ہے اور اس کی اصلاح مشکل ہے تو بھی اس سے اجتناب کیا جائے، بواسیر سے شفا کے لیے یہی عمل کسی اور دن (دن کو لازم سمجھے بغیر) کر لیا جائے۔ البتہ اگر عمل کرنے والے شخص کا نظریہ بھی یہ نہ ہو اور عرف میں بھی ماہِ صفر کے آخری بدھ کے حوالے سے رسم یا شفایابی کا نظریہ نہ ہو، بلکہ بطورِ تجربہ اس دن مخصوص اذکار پڑھ کر دم کرنے کے نتیجے میں لوگوں کو شفا ہو رہی ہو اور اسے لازم بھی نہ سمجھا جائے اور اس عمل کے لیے اس دن کو مؤثر نہ سمجھا جائے تو آپ کے دادا جان کا بواسیر بیماری سے بچاؤ کے لیے یہ عمل ان کے مجربات میں سے ہے، اور ایسے مجربات جو قرآنی تعلیمات کے خلاف نا ہوں از روئے شرع ان کا کرنا درست ہے، لہٰذا اس صورت میں مذکورہ عمل کر کے پانی پر دم کر کے بطورِ علاج استعمال کرنا اور لوگوں کو دینا درست ہوگا۔ ''حجة الله البالغة'' میں ہے:

> ''وَأما الرقي فحقيقتها التَّمَسُّك بِكَلِمَات لَهَا تحقق فِي الْمثل وَأثر، وَالْقَوَاعِد الملية لَا تدفعها مَا لم يكن فِيهَا شرك لَا سِيمَا إِذا كَانَ من الْقُرْآن اَو السّنة اَو مِمَّا يشبههما من التضرعات إِلَى الله.''

(اللباس والزينة والأواني وغيرها، ج:۲، ص:۳۰۰، ط: دار الجيل، بيروت)

''الموسوعة الفقهية''میں ہے:

''اَجْمَعَ الْفُقَهَاءُ عَلَى جَوَازِ التَّدَاوِيْ بِالرُّقٰى عِنْدَ اجْتِمَاعِ ثَلَاثَةِ شُرُوْطٍ: اَنْ يَّكُوْنَ بِكَلَامِ اللهِ تَعَالٰى اَوْ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ، وَبِاللِّسَانِ الْعَرَبِيِّ اَوْ بِمَا يُعْرَفُ مَعْنَاهُ مِنْ غَيْرِهٖ، وَاَنْ يَّعْتَقِدَ اَنَّ الرُّقْيَةَ لَا تُؤَثِّرُ بِذَاتِهَا بَل بِإِذْنِ اللهِ تَعَالٰى. فَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نَرْقِيْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَقُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللهِ! كَيْفَ تَرٰى فِيْ ذٰلِكَ؟ فَقَالَ: اعْرِضُوْا عَلَيَّ رُقَاكُمْ، لَا بَأْسَ بِالرُّقٰى مَا لَمْ يَكُنْ فِيْهِ شِرْكٌ وَمَا لَا يُعْقَلُ مَعْنَاهُ لَا يُؤْمَنُ اَنْ يُّؤَدِّيَ إِلَى الشِّرْكِ فَيُمْنَعُ احْتِيَاطًا.''

(باب التداوي بالرقى والتمائم، ج:۱۱، ص:۱۲۳، ط:دارالسلاسل)

فقط واللہ اعلم

فتویٰ نمبر: 144202200764 دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

صفر کے مہینے میں مصیبتوں کا اُترنا

سوال

آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ صفر کے مہینے میں ساری آفتیں اور مصیبتیں زمین پر اُترتی ہیں، اس لیے ان سب سے حفاظت کے لیے ہر نماز کے بعد ۱۱ مرتبہ یَا بَاسِطُ یَا حَفِیْظُ کا ورد کریں، کیا یہ حدیث صحیح ہے؟

جواب

ذخیرۂ احادیث میں یہ روایت نہیں مل سکی، لہٰذا کسی معتبر سند کے بغیر ایسی بات کرنے سے گریز کیا جائے۔ واضح رہے کہ صفر کے مہینے کو مصیبتوں اور آفتوں کا مہینہ قرار دینا شرکیہ نظریات میں سے ہے، مشرکین ماہِ صفر کو تکلیفوں اور پریشانیوں کا مہینہ سمجھتے تھے، جب کہ اسلام میں اس کی کوئی حقیقت نہیں، نہ قرآن کریم میں ایسی کوئی چیز موجود ہے، نہ ہی حدیث مبارک میں، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے مصیبتوں کو مہینوں اور دنوں کے ساتھ خاص کیا ہے، بلکہ صحیح احادیث مبارکہ میں اس کی نفی وارد ہوئی ہے، چناں چہ بخاری اور مسلم کی روایت ہے:

''أن أبا هريرة رضي الله عنه، قال: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا عدوى ولا صفر ولا هامة.''(صحيح البخاري، كتاب الطب، باب الصفر، وهو داء يأخذ البطن، الرقم: ۵۷۱۷، ۷: ۱۲۸، دار طوق النجاة، ط: الأولى، ۱۴۲۲ھ . صحيح مسلم، باب لا عدوى، ولا طيرة، ولا هامة...، الرقم: ۲۲۲۰، ٤: ۱۷٤۲، دار إحياء التراث العربي)

شارحینِ حدیث نے ''لا صفر'' کے مختلف معانی ومطالب ذکر کیے ہیں، ان میں سے ایک مطلب امام ابوداودؒ نے سند کے ساتھ نقل کیا ہے:

’’ قال – محمد بن راشد–: سمعت أن أهل الجاهلية يستشئمون بصفر، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: لا صفر.‘‘

’’محمد بن راشد فرماتے ہیں کہ میں نے سنا ہے: جاہلیت کے لوگ صفر کے مہینے کو منحوس سمجھتے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ’’لا صفر‘‘، یعنی صفر کے مہینے میں کوئی نحوست نہیں۔‘‘

(سنن أبي داود، كتاب الطب، باب في الطيرة، ٣٩١٥، ٤: ١٨، المكتبة العصرية)

نیز ایسی باتیں سننے، اور آگے پھیلانے سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ فقط واللہ اعلم

فتویٰ نمبر: 144202200161 دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

کیا صفر کے مہینہ میں شادی کر سکتے ہیں؟

سوال

کیا صفر کے مہینے میں شادی کرنا دینی لحاظ سے ٹھیک ہے یا نہیں؟ کیوں کہ ہماری جگہ کا مسئلہ درپیش ہے، اس وجہ سے ماہ صفر میں شادی کرنا مجبوری ہے۔

جواب

ماہِ صفر میں شادی کرنے میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں، ماہِ صفر کے حوالہ سے عوام الناس میں مشہور باتوں کا تعلق محض توہمات سے ہے، جس کی رسول اللہ ﷺ نے سختی سے تردید فرمائی ہے، لہٰذا ان توہمات کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں۔ سیرت کی بعض روایات کے مطابق حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح صفر کے مہینے میں ہوا تھا۔ صحیح مسلم میں ہے:

’’حَدَّثَنِيْ اَبُو الطَّاهِرِ، وَحَرْمَلَةُ بْنُ يَحْيٰى – وَاللَّفْظُ لِأَبِي الطَّاهِرِ – قَالَا: اَخْبَرَنَا ابْنُ وَهْبٍ، اَخْبَرَنِيْ يُوْنُسُ، قَالَ: ابْنُ شِهَابٍ: فَحَدَّثَنِيْ اَبُوْ سَلَمَةَ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ، حِيْنَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ’’لَا عَدْوٰى وَلَا صَفَرَ وَلَا هَامَةَ‘‘، فَقَالَ اَعْرَابِيٌّ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! فَمَا بَالُ الْإِبِلِ تَكُوْنُ فِي الرَّمْلِ كَاَنَّهَا الظِّبَاءُ، فَيَجِيْءُ الْبَعِيْرُ الْاَجْرَبُ فَيَدْخُلُ فِيْهَا فَيُجْرِبُهَا كُلَّهَا؟ قَالَ: ’’فَمَنْ اَعْدَى الْأَوَّلَ؟.‘‘ (صحيح مسلم، ’’ بَابُ لَا عَدْوٰى، وَلَا طِيَرَةَ، وَلَا هَامَةَ، وَلَا صَفَرَ، وَلَا نَوْءَ، وَلَا غولَ، وَلَا يُورِدُ مُمْرِضٌ عَلَى مُصِحٍّ.‘‘، ٤ / ١٧٤٢، رقم الحديث: ٢٢٢٠، ط: دار إحياء التراث العربي – بيروت)

فقط واللہ اعلم

فتویٰ نمبر: 144112201447 دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

نقد و نظر

ادارہ

المختار شرح کتاب الاٰثار

تالیف: حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ۔ اشاعتِ پنجم۔ صفحات: ۶۵۶۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مکتبۃ الحبیب، جامعہ عربیہ اسلامیہ، کمشنر سوسائٹی، ابوالحسن اصفہانی روڈ، کراچی۔ رابطہ نمبر: 0333-3422703

''کتاب الاٰثار'' درحقیقت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ کی تصنیف ہے، جسے امام صاحبؒ کے نامور خاص شاگرد اور فقہ حنفی کے مدوّن ومرتب امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ نے اپنی روایت سے نقل کیا ہے۔ ''کتاب الاٰثار'' کو امام ابوحنیفہؒ نے چالیس ہزار احادیث وآثار میں سے انتخاب کرکے ترتیب دیا ہے۔ حدیث کی تمام کتابوں میں اس کتاب کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہ پہلی کتاب ہے جسے ابوابِ فقہیہ پر ترتیب دیا گیا ہے، اور زیادہ تر مختلف فیہ مسائل کے اعتبار سے ابواب قائم کیے گئے ہیں، جس سے کتاب کی اہمیت اور افادیت بڑھ گئی ہے۔ یہ کتاب اصل میں تو امام ابوحنیفہؒ کی تصنیف ہے، مگر بہت سے شاگردوں نے امام صاحبؒ سے اس کو نقل کیا ہے، اس لیے اس کتاب کی نسبت شاگردوں کی طرف بھی کردی جاتی ہے، جیسے ''كتاب الآثار لمحمد بن الحسن، كتاب الآثار لأبي يوسف، وغيره'' یہ نسبت اس لیے کی جاتی ہے کہ یہ شاگرد اپنے استاذ کی تائید کے لیے اصل کتاب میں دیگر مشائخ سے بھی احادیث وآثار اور اقوال نقل کردیتے ہیں۔ امام محمدؒ نے بھی امام ابوحنیفہؒ کی اس کتاب کو اپنی سند سے نقل کرتے ہوئے کتاب میں دیگر تقریباً بیس مشائخ سے روایات نقل کی ہیں۔ اور اپنے مذہب اور شیخ کے مذہب کے بیان کے لیے اضافہ جات کیے، جس سے کتاب کی افادیت دو چند ہوگئی ہے۔ اُردو میں اس کتاب کی شروحات عموماً میسر نہیں تھیں، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے سابق رئیس حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اس علمی تشنگی کو دور کرنے کے لیے شرح کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کتاب کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت شرح بھی فرمادی، یہ شرح یقیناً اس کتاب کی مکمل شرح ہے، جس میں کئی فقہی اور فتاویٰ کی کتب سے فقہی مسائل وجزئیات بھی نقل کردی گئی ہیں۔ اس کتاب کی اردو شرح نہ ہونے سے اردو داں طبقہ میں جو ایک قسم کی علمی تشنگی تھی، وہ الحمد للہ دور ہوگئی ہے۔ اس شرح کی پہلی اشاعت ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۱ء میں ہوئی تھی، اور اب یہ پانچویں اشاعت ہے، ماشاء اللہ۔ نیا ایڈیشن پرانی کتابت کا فوٹو لے کر چھاپا گیا

ہے، مگر طباعت صاف ستھری ہے، کاغذ مناسب ہے۔ البتہ جلد بندی مضبوط ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کا نفع عام فرمائے اور شارح رحمۃ اللہ علیہ اور ناشرین کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے اور حضرت شارح رحمۃ اللہ علیہ کی دیگر قیمتی اور نایاب کتب کو بھی از سرِ نو منظرِ عام پر لانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

پانچ منٹ کا مدرسہ (حصہ اول [ماہ محرم الحرام تا جمادی الثانیہ])

جمع وترتیب: مولانا محمد حنیف عبدالمجید، مولانا نوید امین۔ صفحات: ۴۰۰۔ قیمت: درج نہیں۔
ناشر: بیت العلم، فائزہ ٹیرس، نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی۔ رابطہ نمبر: 0322-2583199

زیرِ نظر مجموعہ عوامی حلقوں میں درسی مقاصد کے لیے تیار کیا گیا ہے، جس کا مواد ہمہ جہت ہے، جس میں ایمانیات، عبادات، معاملات، معاشیات اور اخلاقیات ہر شعبہ سے متعلق مواد شامل ہے۔ اس مجموعہ کی کئی خصوصیات ہیں، بالخصوص کم وقت میں عوام الناس کو اسلامی احکامات سے روشناس کرانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ مجموعہ دو حصوں پر مشتمل ہے، سال کے بارہ مہینوں کے اعتبار سے روزانہ کا ایک درس مرتب کیا گیا ہے، جس کے چار بڑے عناوین ہیں: ۱-قرآن، ۲-حدیث، ۳-دعا اور ۴-نصیحت۔ ان چاروں موضوعات میں زیادہ تر معاشرتی اور اخلاقی رہنمائی پر مشتمل آیات واحادیث وغیرہ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی اکثر آیات قرآنی ترتیب سے ذکر کی گئی ہیں، الا یہ کہ کسی خاص موضوع پر کوئی آیت بغیر ترتیب کے بھی لائی گئی ہے، جیسے ربیع الاول کے مہینہ میں سیرت کے حوالہ سے کچھ آیات ترتیب کے بغیر مقدم ذکر کی گئی ہیں۔ چاروں بنیادی عناوین کے تحت اکثر ایک ہی موضوع پر مواد جمع کیا گیا ہے (سوائے بعض مقامات کے)، تاکہ سامعین کو ایک ہی موضوع پر سیر حاصل پیغام مل جائے، مثلاً یکم ربیع الاول کی تاریخ کے موضوعات درج ذیل ہیں: ۱-قرآن کریم: حبِ رسول ﷺ کی اہمیت۔ ۲-حدیث: نبی ﷺ سے محبت/ کامل ایمان۔ ۳-دعا: اللہ ورسول (ﷺ) کی محبت حاصل کرنے کی دعا۔ ۴-نصیحت: حبِ رسول (ﷺ) کے تقاضے۔ نیز ذکر کردہ موضوع پر عمل کرنے کے فوائد اور عمل نہ کرنے کے نقصانات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ دعا بھی ہر دن کے موضوع کی مناسبت سے ذکر کی گئی ہے۔ ہر درس کے آخر میں موضوع سے متعلق سوالات بھی دیے گئے ہیں، تاکہ یاددہانی بھی ہوجائے اور سوالات پوچھنے سے موضوع ذہن میں پختہ ہوجائے اور سامعین کی توجہ اور شوق میں بھی اضافہ ہو۔ تقریباً مکمل مواد مستند اور باحوالہ ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے دو حصوں میں سے پہلا حصہ محرم سے جمادی الثانیہ تک اور دوسرا حصہ رجب المرجب سے ذوالحجہ تک کے دروس پر مشتمل ہے۔ ہماری رائے میں یہ کتاب مساجد، مدارس، اسکول، کالجز، یونیورسٹیوں اور گھروں میں درس کے لیے بہترین مواد پر مشتمل ہونے کی بنا پر بے حد مفید ثابت ہوگی، ان شاء اللہ۔ کتاب کی کمپوزنگ اور سیٹنگ بہترین، طباعت دورنگی ہے۔ ٹائٹل خوبصورت اور جلد بندی مضبوط ہے۔